قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دیگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے (پیشگی)
علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصّہ

اس حصّہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:- اصحاب کہف ۔ معجزہ و کرامت ۔ انسان مجبور ہے یا مختار ۔ مذہب و عقل ۔ طوفان نوح ۔ خضر کی حقیقت ۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں ۔ یونس اور وہان ماہی ۔ حسن یوسف کی داستان ۔ قارون ۔ سامری ۔ علم غیب ۔ دعاء توبہ ۔ لقمان ۔ عالم برزخ ۔ یاجوج ماجوج ۔ ہاروت ماروت ۔ حوض کوثر ۔ امام مہدی ۔ نور محمدی اور پل صراط ۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات ۔ کاغذ سفید دبیز۔
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے ۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات اسمیں اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان قدرتِ بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول۔

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے ۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے ۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب کے متعلق آپ کے دِل میں بہت شکوک ہوں گے

آپ سوچتے ہوں گے کہ خدا کیا ہے، رسول کون ہو سکتا ہے، الہامی کتابوں کی کیا حقیقت ہے، دوزخ و جنّت سے کیا مراد ہے، حشر و نشر کی کیا اصلیت ہے، عذاب و ثواب کا کیا مفہوم ہے، روح کسے کہتے ہیں۔ اسی طرح تمام عقاید مذہبی کے متعلق آپ کبھی نہ کبھی ضرور سوچتے ہوں گے اور جب آپ کسی نتیجہ تک نہ پہونچتے ہوں گے تو بڑی اُلجھن میں پڑ جاتے ہوں گے۔ پھر اگر آپ کو یہ اُلجھن دور کرنا ہے اور تعلیمات اسلام کی اصلی روح جاننا ہے تو "**من و یزداں**" کے دونوں حصّے ملاحظہ فرمائیے۔ جو مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سال کی کاوش و تحقیق اور ۵۰ سال کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ مذہب و متعلقات مذہب سے واسطہ رکھنے والا کوئی سوال ایسا نہیں ہے جس کا جواب آپ کو ان کتابوں میں نہ ملے۔ اس کے علاوہ زورِ تحریر اور حُسنِ بیان کے لحاظ سے بھی یہ اتنا بڑا ادبی کارنامہ ہے کہ اس کی مثال آپ کو کہیں اور مل ہی نہیں سکتی۔

"**من و یزداں**" حصّۂ اول۔ ۶۰۲ صفحات مجلد معہ رنگین گرد پوش، کاغذ سفید ۲۸ پونڈ۔
سات روپیہ آٹھ آنے

"**من و یزداں**" حصّۂ دوم۔ ۴۲۴ صفحات۔ مجلد، کاغذ سفید۔ ۲۴ پونڈ۔
پانچ روپیہ آٹھ آنے

دونوں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول بارہ روپیہ — مینجر نگار

جوش۔ جگر۔ سیماب۔ ماہر وغیرہ بڑے مشہور شاعر ہیں

لیکن خود انھیں بھی پتہ نہیں چلتا کہ کبھی کبھی وہ کیسی فاش غلطیاں کر جاتے ہیں۔ زبان کی غلطی، بیان کی غلطی، فارسی تراکیب کی غلطی۔ عروض و قوافی کی غلطی، لغت کی غلطی — حضرت نیاز نے انھیں مشہور شاعروں کی بعض نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ بڑے سے بڑا شاعر بھی اپنی رو میں بعض ایسی غلطیاں کر جاتا ہے، جو اسے نہ کرنا چاہئے۔ ہر چند ان غلطیوں سے شاعر کی شاعرانہ اہلیت پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن پاکیزہ ذوق جو صرف "مئے بے دُرد" کا عادی ہے، ضرور ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اور اسی "چینِ جبیں" کا نام ہے:۔

"**مالہ و ماعلیہ**" — گرد پوش رنگین۔ قیمت دو روپیہ

دُنیا میں کیا اندھیر ہو رہا ہے

اس کی دردناک داستان اگر آپ کو سننا ہے تو وصی احمد بلگرامی فانی بی۔ اے، کی زبان سے سنئے، جو اپنی مخصوص طرزِ تحریر اور زورِ بیان کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتے۔ اس کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کو شروع کر کے ختم نہ کرنا، انسانی اختیار سے باہر ہے۔ یہ ہے:۔ "**ملک خطا کے شہزادے**" قیمت بارہ آنے۔

جوشؔ ملیح آبادی کی مشہور نظم حرفِ آخر

ابھی تک مکمل شایع نہیں ہوئی، لیکن اس کے مختلف اجزاء رسایل و جرایدمیں آچکے ہیں اور اُن کے مطالعہ کے بعد ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ واقعی وہ جوشؔ کے طنزیات کی آخری حد ہے، جس میں خدا سے خطاب کرکے انسان وہ سب کچھ کہہ گیا ہے، جو عالمِ سرمستی میں کہہ سکتا ہے اس میں شک نہیں یہ نظم واقعی جوشؔ کا حرفِ آخر ہے، لیکن اس کے جواب میں ایک دوسرے شاعر کا حرفِ آخر بھی سُن لیجئے :۔

"قولِ فیصل"

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر، علی اختر اخترؔ حیدرآبادی نے جوشؔ کے تمام خیالات کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے، کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے، لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے، جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے، اس نظم میں جو ایکہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے شیطان و شاعر کا مکالمہ کے ذریعہ سے رموزِ کائنات اور اسرارِ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، رہی اس کی فنی حیثیت سو ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اخترؔ کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ فنِ شعر میں اس سے زیادہ ترقی کی تمنا کوئی کر ہی نہیں سکتا ۔۔۔ معہ مقدمہ از نیاز فتحپوری ۔ کاغذ ۲۰ پونڈ دبیز ۔ گرد پوش رنگین ۔ قیمت دو روپیہ

شادی کے باب میں عمر کا تفاوت کتنا بڑا ظلم ہے

یہ ہے اصل مسئلہ جس پر جناب نظیر جمیلی ام ۔ اے نے اس کتاب میں قلم اُٹھایا ہے ۔ پھر یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے صوبۂ بہار کا اور ایسا دردناک واقعہ کہ کوئی اسے فراموش کر ہی نہیں سکتا ۔۔۔ ایک معمر شوہر کی جوان بیوی اور اس کے سوتیلے جوان لڑکے کی داستان معاشقہ ہے اور اس درجہ دلچسپ اندازِ بیان میں کہ پڑھنے والے پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے ۔ اس ناول کی جان وہ خط ہے جو بیوی نے اعترافِ قصور میں اپنے شوہر کو لکھا ہے اور جس کو پڑھنے کے بعد بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔

گوہر ——— گوہر ——— گوہر

قیمت ایک روپیہ

تین مقدّس ہستیاں بے نقاب

ایک جید مولوی، ایک صاحبِ دل درویش، ایک مشہور ناظم یتیم خانہ ۔ یہ ہیں تین مقدس ہستیاں جن کے چہرہ سے نقاب اُلٹ کر حضرت نیازؔ نے ان کے صحیح خدوخال آپکے سامنے پیش کئے ہیں ۔ آپ پڑھکر حیران رہجائیں گے کہ کیا مذہب، تصوف و اخلاق کے پردے میں انسان اس قدر درندہ ہو جاتا ہے ۔ یہ تینوں افسانے حضرت نیازؔ نے اپنی دورِ افشاپردازی کے اس دور میں لکھے تھے جب انکا طنز اور مزاح اپنی پوری جوانی پر تھا ۔ اگر آپنے ابھی تک اس کا مطالعہ نہ کیا ہو تو اب ملاحظہ فرمائیے :۔ **"نقاب اُٹھ جانے کے بعد"** ۔ قیمت آٹھ آنے

مغل لائن لمیٹڈ

سب سے قدیم جہازراں کمپنی

مغل لائن مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ اس موسم میں رمضان کے بعد حسب ذیل چار جہاز حاجیوں کیلئے روانہ ہونگے:-

اس اس علوی	وزنی ۳۵۶۶ ٹن	روانگی بمبئی سے	یکم اگست ۴۹ء
اس اس اسلامی	وزنی ۵۸۷۹ ٹن	روانگی بمبئی سے	۲ر اگست ۴۹ء
اس اس مظفری	وزنی ۷۰۲۴ ٹن	روانگی بمبئی سے	۳ر اگست ۴۹ء
اس اس جہانگیر	وزنی ۳۵۶۶ ٹن	روانگی بمبئی سے	۶ر اگست ۴۹ء

کرایہ معہ مصارف خوراک

بمبئی سے جدّہ اور واپسی کے لئے

درجۂ اول :- ۱۱۰۵ روپیہ

عرشہ :- ۳۹۸ روپیہ

اس کرایہ میں مصارف قرنطینۂ کامران، جدہ سینی ٹیشن اور کرایہ کشتی شامل نہیں ہیں جس کی مقدار ۴ر۷ روپیہ - ۱۲ر آنہ ہوتی ہے۔

حاجیوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک بمبئی نہ آئیں جب تک کمپنی کی طرف سے ان کو اطلاع نہ پہونچے

حاجیوں کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ طاعون اور چیچک کا ٹیکہ لگوا کر گھر سے روانہ ہوں اور میونسپلٹی کے افسران ہیلتھ سے انٹرنیشنل فارم پر اس کا سارٹیفکٹ حاصل کرلیں۔

کوئی رقم پیشگی روانہ نہ کی جائے جب تک آپ کو لکھا نہ جائے۔

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

بینجنگ ایجنٹس مغل لائن لمیٹڈ

۱۶- بنک اسٹریٹ فورٹ بمبئی

میرا گرمی کا ساتھی

ساتھی وہ ہے جو مصیبت میں، خطرہ میں اور بیماری میں آدمی کا ساتھ دے اور اسے ان سے بچائے۔ روحِ افزا بھی گرمی کے موسم کی ہر تکلیف میں ۴۳ سال سے انسان کا سچا ساتھی ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ روحِ افزا اندر سے جسم میں ٹھنڈک ڈال کر آدمی کو سارے دن چاق چوبند رکھتا ہے۔ قیمتی دواؤں لذیذ پھلوں اور مہکتے پھولوں سے جدید سائنٹفک طریقوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ دو روپے آٹھ آنے فی بوتل

رسالہ ہمدرد گرما جس میں گرمی کے موسم کے ہر مرض کا آسان علاج درج ہے
اُردو ہندی اور انگریزی میں مفت طلب فرمائیے

روح افزا

ہر جگہ ملتا ہے

ہمدرد دواخانہ لیبارٹریز دہلی

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۵۶ | فہرست مضامین اگست ۱۹۴۹ء | شمار ۲

ملاحظات ---------- ۵

ترقی پسند ادب، ادب نہیں صحافت ہے ... خلیل الرحمٰن اعظمی ... ۹

عالم خواب کی پیشگوئیاں --- سہیل بخاری (بی۔اے) ۱۷

اقبال میدانِ حشر میں ---- غلام سرور ---- ۲۹

ام۔ان رائے کی مشہور کتاب --- عبدالمالک آروی --- ۴۰

شادی بیاہ کے گیت ---- بسم اللہ بیگم ---- ۴۵

غزل ---------- اسد بھوپالی --- ۴۹

آیندہ جنگ کی طیاریاں ---------- ۵۰

انتخاب کلام حسرت استاد جرأت ---------- ۵۲

انتخاب کلام رضا علی وحشت ---------- ۵۳

مطبوعات موصولہ ---------- ۵۴

کلام شفیق جونپوری ---------- ۵۶

مرثیہ نگاری اور میر انیس ... ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ۵۷-۶۴ / ۶۵-۷۲

ملاحظات

آزادی کے دو سال

گھڑیاں خوشی کی ہوں یا غم کی، گزر ہی جاتی ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء معلوم ہوتا ہے کل کی بات ہے، لیکن اس کو بھی دو سال ہو گئے اور اگر ان تمام واقعات و حالات کو سامنے رکھا جائے جو اس زمانہ میں پیش آئے تو غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس دو سال میں ہم پر صدیاں گزر گئیں۔

ہندوستان نے حصول آزادی کے لئے خون نہیں بہایا، تو آزادی ملنے کے بعد یہ فدیہ اس نے ادا کیا اور اس طرح آخر کار وہ سُنّت بھی ادا ہو گئی جو اس سے قبل دُنیا کی قوموں کو ہمیشہ ادا کرنا پڑی ہے — لیکن اب سوال نہ اس خون کی مقدار کے تعین کا ہے اور نہ یہ کہ بہ اندازۂ قربانی ہم کو کیا ملا، بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہماری ذہنیتوں پر اس کا کیا اثر ہوا، نیز یہ کہ مستقبل ہمارے لئے کیا توقعات و خطرات اپنے پاس رکھتا ہے۔

ہندوستان تقسیم ہو چکا اور شاید پھر کبھی ایک نہ ہونے کے لئے اس کے دو ٹکڑے ہو گئے، لیکن اس کے دردناک نتائج کا

کا سلسلہ ابھی جاری ہے اور ہو سکتا ہے کہ دستِ قضا میں کوئی ایسا فیصلہ بھی ہو جس کا ہم اس وقت تصور نہ کر سکتے ہوں، بہر حال آیندہ جو کچھ بھی ہو، مگر اس وقت تک جو کچھ ہماری آنکھوں نے دیکھا، ہمارے کانوں نے سُنا اور ہمارے دلوں نے محسوس کیا وہ مایوس کُن ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستان آزاد نہیں ہوا بلکہ پہلے سے زیادہ سخت غلامی کی زنجیروں میں جکڑتا چلا جا رہا ہے ـــــ کہا جاتا ہے کہ قوموں کی عمر میں سالوں کی مدت بھی لمحوں میں شمار ہوتی ہے اور دو سال کی مدت ایسی چیز نہیں جس میں ہم کسی عظیم تغیر کی توقع کر سکیں - یہ بالکل درست ہے، لیکن اگر ہوا کے رُخ سے موسم پہچانا جا سکتا ہے، اگر بنیاد کو دیکھ کر تعمیر کے متعلق کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے، تو ہم پھر وہی کہیں گے جو ابھی کہا، اور آج نہیں تو کل اس آزادی کے علمبردار خود بھی محسوس کریں گے کہ ان کی تعمیر حکومت کی بنیاد کس قدر کج، کس درجہ ناا ستوار، کتنی ناہموار تھی اور یہ کہ آزادی کا جو مفہوم انھوں نے قرار دیا تھا وہ کس قدر سطحی اور غیر حقیقی تھا۔

انھوں نے سمجھا کہ صرف فرنگی کو یہاں سے نکال دینا آزادی ہے، حکومت کی مسند پر قابض ہو جانا اصل مقصود ہے، حالانکہ غلامی نام فرنگی کا نہیں بلکہ فرنگیت کا تھا، اہلِ مغرب کا نہیں بلکہ مغربیت کا تھا، ان سفید فام چہروں کا نہیں جو یہاں دفتر کی کرسیوں پر بیٹھے نظر آتے تھے بلکہ اس حکومت و ذہنیت کا تھا جس نے ترقی کا مفہوم ہی سرے سے غلط سمجھا اور جس میں بدقسمتی سے ہم بھی مبتلا ہیں -

آج دُنیا میں کوئی قوم، کوئی حکومت ایسی نہیں جو امن و سکون کی جستجو کی مدعی نہ ہو، یہاں تک کہ جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں ان کا مقصد کا امن جیتنا ہی ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن امن و سکون کی جگہ دُنیا اور زیادہ ہلاکت و بربادی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے - کیوں ؟ - محض اس لئے کہ جو راہ اس نے امن و سکون تک پہونچنے کے لئے اختیار کی ہے وہی سرے سے غلط ہے اور جس جذبہ کو سامنے رکھ کر ترقی کے راستے متعین کئے جاتے ہیں وہی دشمنِ امن و سکون ہے۔

اس وقت دنیا کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی سخت طوفان آجائے اور انسانوں کو پناہ کی کوئی جگہ نہ ملے، جیسے کوہ آتش فشاں پھوٹ پڑے اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئے - ہر ملک اپنی جگہ خائف ہے کہ دوسرا اسے نگل نہ جائے، ہر قوم ڈر رہی ہے کہ کوئی دوسری قوم اسے تباہ نہ کر دے ـــ اشتراکیت و جمہوریت کا تصادم، سرمایہ داری و طبقۂ عمال کی باہمی کشاکش، امتیاز رنگ و نسل کے جھگڑے، تقسیم دولت کا عدم توازن، اقتصادی مشکلات اور صنعت و تجارت میں مجنونانہ مسابقت ـــ ان سب نے قوموں کی ایسی حالت کر دی ہے کہ "لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس"۔

مشینیں رات دن چل رہی ہیں، ایجادوں پر ایجادیں ہو رہی ہیں، سائنس کے معجزے نو بنو روز ظاہر ہوتے جاتے ہیں، سر بفلک عمارتیں بنتی جا رہی ہیں، دولت کے ڈھیر لگتے جا رہے ہیں - لیکن انسان پہلے سے کہیں زیادہ بھوکا، ننگا اور محتاج ہے ـــ کیوں ؟ ـــ صرف اس لئے کہ انسان امن و سکون کی جستجو کر رہا ہے مشینوں سے، دولت کی پیداوار سے، اقتدار و تسلط سے، حالانکہ اس کی اصل جگہ روح ہے اور روحانیت ہی سے اُسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

انسان ہمیشہ سے بُت پرست رہا ہے، اور اسی بُت پرستی نے اسے ہمیشہ تباہ کیا۔ فرق یہ ہے کہ پہلے وہ پتھروں کے بُت بناکر پوجتا تھا اور آج وہ مشینوں اور اپنے ذہنی بتوں کی پوجا کر رہا ہے جن کا نام اس نے وطنیت، قومی روایات، قومی کلچر، قومی جھنڈا اور جماعتی مفاد رکھ چھوڑا ہے۔

آج کل کے بعض مفکرین سوچ رہے ہیں کہ اگر دُنیا کی تمام حکومتیں وفاقی حیثیت سے کسی ایک مرکزی حکومت سے وابستہ ہوجائیں تو باہمی نزاع ختم ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ کوئی نیا تجربہ نہ ہوگا، مسیح سے تین صدی پہلے یونان نے بھی یہی کوشش کی تھی لیکن آخرکار کارتھیج، شام، مصر اور اطالیہ سب اس سے جدا ہوکر مستقل سلطنتوں میں تبدیل ہوگئے اور یونانیوں کے قومی غرور کو برداشت نہ کرسکے۔

سلطنتِ روما نے بھی قدیم زمانہ میں ساری دُنیا کو ایک ہی حکومت کے سایہ میں امن وسکون کی زندگی بسر کرنے کی دعوت دی تھی، لیکن نوع انسانی کو اس کے عوض میں کتنی عظیم الشان روحانی قربانیاں کرنی پڑیں!

یولی نیشیا نے فن جہاز رانی میں کتنا کمال حاصل کیا تھا، لیکن کیا آج سمندر کے کسی حصّہ میں اس کا نام لیا جاتا ہے۔

اسپارٹا نے کیسے کیسے سورما پیدا کئے، لیکن اس کا جو حشر ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

ہٹلر اور مسولینی بھی تو یہی چاہتے تھے کہ وہ ساری دنیا کو ایک ہی فاسستی جھنڈے کے نیچے لاکر سلطنتوں کے اختلاف ونزاع کو ختم کردیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود ہی ختم ہوگئے۔

الغرض دُنیا میں بڑی بڑی تہذیبیں، بڑی بڑی حکومتیں آئیں اور آخرکار وہ ختم ہوکر رہیں، کیونکہ ان سب کی بنیاد قومی غرور پر قایم تھی اور ان میں سے کسی کے سامنے نوع انسانی کی خدمت کا سوال نہ تھا۔

پھر اگر آج روس اور امریکہ انھیں اصول کو سامنے رکھ کر دُنیا پر چھا جانا چاہتے ہیں، تو ممکن ہے وہ کچھ عرصہ کے لئے کامیاب ہوجائیں، لیکن نتیجہ وہی ہوگا جو دوسری قوموں کا ہوا اور امن وسکون خود انھیں بھی نصیب نہ ہوگا، دوسروں کا کیا ذکر ہے۔

یہ ہیں تاریخ امم کے وہ نہ مٹنے والے نقوش، جن پر ہندوستان کو بھی نظر رکھنی چاہیئے تھی، لیکن افسوس ہے کہ ان حقایق کو پس پشت ڈالدیا گیا اور اس نے بھی ترقی کی انھیں راہوں کو سامنے رکھا جو انگریز بنا گیا تھا اور قومیت و وطنیت کی اسی بُت پرستی میں گرفتار ہوگیا جو مہاتما گاندھی کے بلند نصب العین سے بدرجہا فروتر چیز ہے۔

مہاتما گاندھی نے ہمیشہ یہی کہا کہ حقیقی حکومت وہی ہے جو لوگوں کے دلوں پر قایم ہو اور یہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی، جب تک اس میکانکی دُنیا کے سہاروں کو چھوڑکر روحانیت پر اس کی بنیاد نہ قایم کی جائے۔

وہ ترقی کے میکانکی ذرایع کو پسند نہ کرتے تھے، وہ ملک کی دولت کو سامنے رکھ کر اس کی کامیابی وناکامی پر حکم نہ لگاتے تھے، بلکہ اچھی حکومت کا معیار ان کے نزدیک صرف روحانی سکون، اخوت عامہ اور انسانیت پرستی تھی۔ ان کے سامنے وطنیت و قومیت کا تنگ دائرہ نہ تھا بلکہ وہ دُنیا کے تمام انسانوں کو ایک ہی برادری اور ایک ہی قوم اور ایک ہی جماعت تصور کرتے تھے۔

پھر ہندوستان کے ارباب حکومت کہتے تو یہی ہیں کہ وہ مہاتما گاندھی مرحوم کے اُصول پر چلتے ہیں، لیکن کیا ان کا یہ دعویٰ عمل سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیا وہ کہہ سکتے کہ ان میں وہی فراخدلی، وہی بے تعصبی، وہی بلندی اخلاق، وہی بے نفسی اور وہی جذبۂ انسانیت پرستی پایا جاتا ہے، جس کی تعلیم مہاتما گاندھی نے دی تھی۔

اس میں شک نہیں حکومت سنبھالتے ہی کانگریس کو غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اگر دو سال کی مدت میں ان دشواریوں کو دور نہیں کیا جا سکتا تھا تو کم از کم ان میں کمی ضرور پیدا کی جا سکتی تھی، کسی خوشگوار مستقبل کے آثار تو ضرور نمودار ہو سکتے تھے، لیکن حال یہ ہے کہ بجائے کمی کے ان میں روز اضافہ ہو رہا ہے اور خود اعضاء حکومت ہی میں اختلاف و انتشار بڑھتا جا رہا ہے، اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کے نہ رہنے سے کانگریس کی روح ختم ہو گئی ہے اور اس کی حیثیت اب ایک ایسے بے جان جسم کی سی ہے، جس کے اعضا سڑنے لگے ہیں اور جن کی عفونت سارے ملک میں پھیل رہی ہے۔ چنانچہ خود پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی کلکتہ کی ایک تقریر کے دوران میں اس کو تسلیم کیا ہے کہ "اقتدار و حکومت ملنے کے بعد کانگرس والوں کی ذہنیت پست ہوتی جا رہی ہے اور وہ خود غرضی کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں"۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ:۔ "مجھے پروا نہیں اگر کانگریس انتخاب میں ہار جائے، کیونکہ اس صورت میں اس بات کا امکان ہے کہ کانگرس کی روح تباہ ہونے سے بچ جائے"۔

اس کے بعد ہی جب وہ لکھنؤ تشریف لائے تو انھوں نے کانگریسیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "اگر ہماری موجودہ تنگ نظری اور تنگ دلی کا صرف یہی علاج ہے کہ ہم خود کانگرس کو ختم کر دیں، تو یہی زیادہ مناسب ہے اور اسوقت کا انتظار نہ کریں جب کوئی اور چھری مار کر ہمیں ہلاک کرے"۔

کرپلانی جی نے ان سے زیادہ واضح الفاظ میں ماتم کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔ "ملک کی خدمت کا خیال کسی کو نہیں، مزدور کام چور ہو گئے، سرمایہ دار لوٹنے لگے، کسان غلّہ جمع کرنے لگے، مسلم لیگ ختم ہو گئی تو ہندوؤں کی مسلم لیگ راشٹریا سیوک سنگھ نے اس کی جگہ لیلی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک پاگل ہو گیا ہے"۔

قدوائی صاحب کہتے ہیں کہ "اس وقت ملک میں رشوت اور ذاتی اغراض کے حصول کا بازار گرم ہے، اور اگر کانگرس پر عوام کو بھروسہ نہیں ہے تو وہ اسے ہرگز ووٹ نہ دیں۔ کانگرس مرے یا جیئے، ملک کو زندہ رہنا چاہیئے"۔

بات یہ ہے کہ گاندھی جی کے زمانہ میں سب کا مرکز خیال ایک تھا اور اب سب کی رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہاں تک کہ خود مرکزی حکومت کے ارباب حل و عقد میں بھی پالیسی و عمل دونوں کا اختلاف پایا جاتا ہے اور ملک کی حالت ایک ایسی کشتی کی سی ہے جس کے متعدد ناخدا اسے کسی مخصوص سمت لیجانے پر متفق نہ ہوں اور وہ ساحل سے دور ڈگمگا رہی ہو ـــــ یہ ہے دور آزادی کے پہلے دو سال کی کوششوں کا ماحصل اور یہ ہے گاندھی جی کے نام لینے والوں کا اخلاقی انحطاط۔

ترقی پسند ادب، ادب نہیں صحافت ہے

اس عنوان سے مارچ ۱۹۴۹ء کے نگار میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا ایک مضمون شایع ہوا ہے جسے مینے پڑھنا شروع کیا تو مجھے یہ پوری توقع تھی کہ موصوف ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۴۹ء تک کے ترقی پسند ادب کا جائزہ لیں گے اور ان تمام شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے ادبی سرمائے سے بحث کرتے ہوئے انکے کارناموں کا کھرا کھوٹا الگ کرکے دکھائیں گے، جن کا اس تحریک سے تعلق ہے۔ اس طرح آخر میں ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، مجاز، مخدوم محی الدین، فیض، راشد، سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کی شاعری کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، اپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، اختر انصاری اور ممتاز مفتی وغیرہ کے افسانے، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، سجاد ظہیر اور ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ کی تنقیدیں ادب نہیں بلکہ صحافت ہیں۔ لیکن جب میں نے اس مضمون کو ختم کیا تو مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ کسی طالب علم کی وہ تقریر ہے جو اس نے اپنے اسکول کے سالانہ مباحثے میں کی تھی، جسے نیاز صاحب نے محض دلچسپی کی خاطر شایع کر دیا ہے اور کاتب نے غلطی سے "میر انیس اور مرثیہ نگاری" والے مضمون کے علاوہ اس مضمون کے نیچے بھی ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا نام لکھدیا ہے لیکن بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ کاتب بیچارے کا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ یہ مضمون فاضل نقاد کے قلم کا مرہون منت ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ میں پرنسپل عبدالشکور، اویس احمد ادیب، اختر علی تلہری اور محمد احسن فاروقی جیسے نقادوں کی "مدرسانہ تنقیدوں" کو بڑی اہمیت دیتا ہوں بلکہ اس لئے کہ یہ مضمون سرے سے تنقید ہی نہیں ہے بلکہ کسی مباحثے کی تقریر معلوم ہوتی ہے جس میں اگر عنوان دیا جائے کہ "جمہوری نظام حکومت انسانی ترقی کے لئے مضر ہے" تو مباحثے میں حصہ لینے والا وہ طالب علم جو اس مضمون کی موافقت میں تقریر کرے گا بجائے اس کے کہ جمہوریت کی اچھائیاں اور برائیاں الگ الگ کرکے بیان کرے اور شہنشاہیت و فسطائیت کو اس کے مقابلہ میں ترجیح دینے کے دلایل پیش کرے، صرف یہ کرے گا کہ جمہوریت کی خرابیاں تلاش کرکے نمبروار اسے بیان کرتا جائے گا، کیونکہ اسے اس سے کیا سروکار کہ جمہوریت میں کوئی خوبی بھی ہے اسے تو صرف جمہوریت کو انسانی ترقی کے لئے مضر ثابت کر دینا ہے، یہ باتیں اگر وہ چاہے تو دو منٹ کے اندر کہہ سکتا ہے لیکن اسے دس منٹ تک اسٹیج پر بولنا ہے اس لئے وہ ان باتوں کو طول دینے کے لئے لطیفوں، قصوں اور پھبتیوں کا سہارا لے گا اور

اس وقت تک بولتا رہے گا جب تک سامعین اس کی بے سر و پا باتوں سے تنگ آکر شور نہ مچانے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون میں مواد اور لب و لہجہ دونوں اعتبار سے کچھ اسی قسم کی ذہنیت کارفرما ہے۔ مجھے اس مضمون کے جواب میں ترقی پسند ادب کے اغراض و مقاصد یا اس کی ضرورت اور اہمیت نہیں بیان کرنا ہے اور نہ ترقی پسند شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے کارناموں کا جایزہ لیکر ان کے وجود کے لئے جواز پیش کرنا ہے، کیونکہ ترقی پسند ادب پر نہ صرف تفصیل سے لکھا جا چکا ہے بلکہ ان نقادوں کا جواب بھی دیا جا چکا ہے جنھوں نے معقولیت اور سنجیدگی کے ساتھ اس تحریک پر تنقید کی تھی، اور یہ امر فطری بھی تھا کیونکہ ہر نئی چیز کو شک و شبہے کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اب وہ دور گزر چکا ہے، اب تو قدامت پسندوں اور ترقی پسندوں کے گروہ الگ الگ ہو چکے ہیں، ان کی بحثیں بھی ختم ہو چکی ہیں اور اب ہر ایک اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول ہے۔ ان میں سے بعض بزرگ جو ابتدا میں کچھ قدیم سے لگاؤ کی وجہ سے اور کچھ اس تحریک کے مقاصد واضح نہ ہونے کی وجہ سے اس سے بدظن تھے اب اس کے حامی ہو چکے ہیں جن میں اثر لکھنوی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مگر جو لوگ بنیادی طور پر اس چیز کے قایل ہیں کہ پرانی چیزوں میں ردوبدل کیا ہی نہیں جا سکتا، ادب کے قدیم اسالیب مکمل ہیں اور ان میں کسی قسم کے اضافے کی ضرورت ہی نہیں ہے ان سے تو الجھنے کا سوال ہی نہیں ہے اور نہ انھیں ترقی پسند ادب کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ انھیں اب بھی اس بات کی آزادی حاصل ہے کہ وہ پرانے ڈھنگ کی شاعری کریں، پرانے قسم کے افسانے لکھیں اور قدیم اصولوں کے مطابق ادب کی تخلیق کریں، یہی نہیں بلکہ اگر وہ خود ادیب نہیں ہیں اور صرف انھیں ادبی کتابیں پڑھکر خط اٹھانا ہے تو بھی انکے لئے سرمائے کی کمی نہیں ہے کیونکہ اب بھی سیماب اکبرآبادی، نوح ناروی اور ماہر القادری زندہ ہیں اور ان کے ہزاروں لاکھوں شاگرد اس ادب کی تخلیق کر رہے ہیں جسے ترقی پسندی کے الزام سے متہم نہیں کیا جا سکتا، اب بھی ایم، اسلم، قیسی رامپوری، رشید اختر ندوی کی کتابیں ہر مہینے بازاروں میں آتی ہیں جن کی تحریروں میں نہ تو اشتراکیت کا پروپگنڈہ ہوتا ہے نہ بھوک، جنگ، قحط بنگال، مزدور اور کسان، فسادات، آزادی، ۱۵ اگست وغیرہ وقتی موضوعات ہوتے ہیں جو صرف صحافت کے لئے موزوں ہیں۔ ان کے علاوہ وہ لوگ جن کے ذہن اب بھی صاف نہیں ہیں، جو بنیادی طور پر قدامت پسندی کے نہیں قایل ہیں اور خلوص کے ساتھ اس تحریک کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لئے مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، فیض احمد فیض وغیرہ کے مضامین اب بھی کافی ہیں اور اگر وہ ان کا بغور مطالعہ کریں تو ترقی پسند ادب ان کے لئے کوئی معمہ نہ رہے گا۔ لیکن ادھر چند سالوں میں ترقی پسند ادب کی تحریک کی مخالفت جس طرح کی جا رہی ہے اس نے مجھے اس نتیجے پر پہونچایا ہے کہ اب قدیم و جدید کا جھگڑا نہیں رہا کیونکہ پرانے لوگ تو اب خاموش ہو کر بیٹھ گئے ہیں، اب اس کی مخالفت ایک اور ہی نوعیت سے کی جا رہی ہے۔ یہ لوگ اگلے وقتوں کے "دنیانوسی" نہیں ہیں۔ یہ نئی تعلیم سے بہرہ ور ہیں اور نئی روشنی، سائنس اور موجودہ دور کی تمام ترقیات پر

ایمان بھی رکھتے ہیں - یہ کل تک ترقی پسند ادب کے زبردست حامی تھے اور ہر نئی چیز کو سراہتے تھے - سماج، مذہب اور پرانے نظام سے بغاوت کو ضروری سمجھتے تھے لیکن آج یہی لوگ یہ شور مچا رہے ہیں کہ ترقی پسند ادب بڑی خطرناک چیز ہے یہ ادب نہیں یہ تو اشتراکیت کا پروپگنڈہ ہے اور اسی لئے اس کی قدر و قیمت صحافت سے زیادہ نہیں - یہ لوگ بار بار کہتے ہیں کہ ہم قدامت پسند نہیں ہیں، ہم بھی ادب برائے زندگی کے قایل ہیں، جب تک ترقی پسند ادب میں مذہب کو گالیاں دیجاتی تھیں، جنسی بیباکی کا اظہار ملتا تھا، خدا اور رسول، مولوی اور جنت کا مذاق اڑایا جاتا تھا اسوقت تک یہ لوگ، خود اسی ادب کی تخلیق کرتے تھے اور سماج، مذہب اور قدیم نظام کی پابندیوں کے خلاف پروپگنڈہ کرنے میں حصہ لیتے تھے لیکن جیسے ہی ہمارے ادیب و شاعر نے چند ایسی حقیقتیں پیش کرنی شروع کیں جس میں ان لوگوں کے گھناؤنے چہرے بے نقاب ہو گئے جن کے سہارے ان حضرات کا اقتدار قایم تھا تو یہ لوگ فوراً اس تحریک سے الگ ہو گئے کیونکہ ہمارے شاعروں اور افسانہ نگاروں نے قحط بنگال پر لکھنا شروع کر دیا جس میں سرمایہ داروں اور مہاجنوں کی قلعی کھلتی تھی اور مسلم لیگی وزارت کے ہتھکنڈے سامنے آجاتے تھے، انھوں نے ۱۵ اگست کو ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھ کر اور اس تقسیم کے بعد پنجاب، دہلی، بہار اور نواکھالی میں وحشت اور بہیمیت کے مظاہروں سے متاثر ہو کر عوام کے دلوں کا درد محسوس کیا اور ان لوگوں کے خلاف اپنی آواز اٹھائی جن کے ہاتھ اس خون میں رنگے ہوئے تھے - ان حقیقتوں کا ظاہر ہونا تھا کہ حیات اللہ انصاری بھی ترقی پسند ادب کو سرے سے ادب ماننے سے انکار کرنے لگے، محمد حسن عسکری، پاکستان میں جا کر یہ شور مچانے لگے کہ یہ ادب، ادب نہیں صحافت ہے، پروپگنڈہ ہے اور یہی نہیں کہ یہ ادیب و شاعر ادنیٰ درجے کا ادب پیدا کر رہے ہیں اگر اتنا ہی ہوتا تو کیا حرج تھا، خود ان کا ادب زندہ نہ رہتا، وہ خود اپنی ادبی زندگی کو موت کے گھاٹ سلا رہے تھے لیکن یہ ادیب و شاعر تو جناح اور پٹیل کے ہندوستان اور پاکستان کے دشمن ہیں اور اس میں بجائے نظام، ٹالا، برلا اور مہاراجہ پٹیالہ کے اقتدار کے ایک اشتراکی نظام چاہتے ہیں - اسی وقت سے ترقی پسند ادب صحافت ہو گیا، حالانکہ پروپگنڈہ تو وہ اس وقت بھی تھا جب حیات اللہ انصاری اور محمد حسن عسکری خود کو ترقی پسند افسانہ نگار سمجھتے تھے اس وقت "کمزور پودا"، "بھسمان" اور "میلاد شریف" سے اگر مولوی برہم ہوتے تھے تو ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے لیکن اب "ان داتا"، "پشاور اکسپریس" اور "طوائف کا خط" جیسے افسانے یہ حضرات لکھتے تو انھیں پڑھکر ہندوستان اور پاکستان کے حکمراں صرف برہم ہو کر نہ رہ جاتے بلکہ ان لوگوں کو اپنی ملازمتوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا اور کیا عجب کہ ان کو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑتیں - اس لئے اگر یہ پروپگنڈہ گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد یا نواب زادہ لیاقت علی خاں کی اسلامی حکومت کا پروپگنڈہ ہوتا تو حیات اللہ انصاری اور حسن عسکری اسے اب بھی ادب مانتے لیکن اشتراکیت کے پروپگنڈے میں تو انسان کو بجائے ذاتی فائدے کے دار و رسن سے سابقہ پڑتا ہے اور ایسے ادب کو دور ہی سے سلام - یہی نہیں بلکہ اب اپنے دل کو تسکین دینے کے لئے

یہ ثابت کرو کہ اس قسم کا ادب، ادب ہی نہیں صحافت ہے۔

لیکن بیچارے احسن فاروقی صاحب نے ترقی پسند ادب کو صحافت ان معنوں میں نہیں کہا ہے اور میں ان کو ہرگز اس زمرے میں شامل نہیں کرنا چاہتا جس میں حسن عسکری اور حیات اللہ انصاری آتے ہیں۔ یہ حضرات تو ایک خاص پالیسی کے ماتحت ترقی پسند ادب کے خلاف محاذ تیار کر رہے ہیں اور اپنی عاقبت سنوار رہے ہیں لیکن محمد احسن فاروقی صاحب کی ترقی پسند ادب سے مخالفت کے صرف دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ یا تو ان کی لاعلمی یا پھر جذباتیت اور ہٹ دھرمی۔ لاعلمی کا جہاں تک تعلق ہے یہ ان سے منسوب نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ بہرحال پڑھے لکھے آدمی ہیں، انھوں نے یورپ اور ہندوستان کے قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کتابوں کو پڑھ کر ہضم نہ کر سکے ہوں اور بجائے حقیقت تک پہونچنے کے اُلجھاؤ (Confusion) میں مبتلا ہو گئے ہوں لیکن ناپختہ ذہن اور بغیر ہضم کئے ہوئے لوگوں کے دماغ میں بھی چند چیزیں تو واضح ہوتی ہی ہیں۔ یہاں تو اس بات کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ موصوف آخر کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ کبھی تو وہ کہتے ہیں کہ میں صحیح ترقی پسندی پر ایمان رکھتا ہوں اور نئی راہوں کے اختیار کرنے کا قایل ہوں لیکن پھر اپنی بات کو خود ہی بھول جاتے ہیں اور ایسی متضاد باتیں کہتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف ترقی پسندی ہی کے دشمن ہیں، کبھی تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ادب میں پروپگنڈہ نہیں ہونا چاہئے لیکن پروپگنڈے سے مراد شاید وہ صرف اشتراکیت کے پروپگنڈے کو لیتے ہیں کیونکہ کرشن چندر بیدی وغیرہ کے افسانوں میں انھیں کوئی بات نظر نہیں آتی اور نہ ان سے حظ اُٹھا سکتے ہیں اور پریم چند کی تعریف کرتے ہیں، حالانکہ یہ ان کو معلوم ہوگا کہ پریم چند خود کسان اور مزدور کا پروپگنڈہ کرتے ہیں، پرانے نظام میں اصلاح چاہتے ہیں اور مقصدی ادب کے قایل ہیں۔ فاروقی صاحب نئی راہوں اور نئے اسالیب کے قایل بھی ہیں لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ شاعری کا حسن عروضی پابندیوں ہی میں ہے اور نظم آزاد کو مطعون کرتے ہیں اور ان کو ایک نظم بھی ایسی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر نظم آزاد کے وجود کے لئے جواز مل سکے۔ غرض اس قسم کا تضاد تو ان کے یہاں ملتا ہی ہے لیکن ایک اور چیز دلچسپ ہے۔ جہاں کہیں انھوں نے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں اور ان کے کارناموں پر بحث کی ہے وہاں مثالوں سے بچنے کی کوشش کی ہے بلکہ جب کبھی انھوں نے ترقی پسندوں کا ذکر کیا ہے اس سے مراد ہرگز وہ لوگ نہیں ہیں جو ترقی پسند ادب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں یا اس کے نمایندے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"اپنی روایات سے بدظنی اور دوسرے ملک کی روایات کو اپنے ادب میں داخل کرنا کوئی بری بات نہیں ہے مگر اس کے لئے جو علم و فکر ضروری ہے وہ ہمارے اُردو داں ترقی پسندوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں"

اس کے علاوہ ترقی پسندوں کی تین قسمیں بتاتے ہیں :-

(۱) وہ جن کی تعلیم تمامتر سائنسی ہے؟ ان کو اپنے درسی مضامین میں مستغرق رہنا پڑتا ہے اور دُنیا کی باتوں

کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا اس لئے عام معاملات پر ان کی رائیں ہمیشہ نیچے درجے کی ہوتی ہیں۔

(۲) ترقی پسندوں کی دوسری قسم ان صاحبزادوں کی ہے جو علوم و ادب مشرقیہ میں اعلیٰ ڈگری رکھتے ہیں، یہ ان علوم کی طرف اس لئے متوجہ ہوئے کہ ان میں حصول سند آسان ہے۔

(۳) تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن ان کو تعلیم سے یا اس کے کسی شعبے سے غرض نہیں رہتی۔ یہ لوگ اگر رئیس زادے نہیں تو رئیس مزاج ضرور ہیں اور یہ لوگ اپنے کو صرف اس لئے ترقی کا علمبردار کہتے ہیں کہ لوگ انھیں پڑھا لکھا کہیں۔

ایک اور جگہ اپنے ایک ترقی پسند دوست کا قصہ بیان کرتے ہیں:۔

"بعض ترقی پسندوں کا یہ حال ہے کہ وہ صحیح و پست ادب میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے مثلاً ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ میری کوریلی کی ناولوں کی بابت آپ مجھے بتائیے! میں نے جواب دیا کہ میں ان کی بابت ایک بات جانتا ہوں اور وہ یہ کہ ادب کے درجہ سے گری ہوئی ہیں۔ یہ بات ان کو بہت شاق گزری اور فرمانے لگے "ان میں اتنے اچھے پلاٹ ہیں اتنے اچھے کردار ہیں اور اتنی اچھی زبان"۔ میں نے کہا آپ کو ناول کے ادبی اور غیر ادبی خصوصیات کا فرق ہی نہیں معلوم۔ ان صاحب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی"

اب میں فاروقی صاحب کی بتائی ہوئی خصوصیات کو مدنظر رکھ کر ترقی پسند ادب کے نمایندوں پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ ترقی پسند جن سے موصوف کو سابقہ پڑا ہے یا جن کا وہ بار بار اپنے مضمون میں ذکر کر رہے ہیں وہ مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، فراق، ڈاکٹر عبدالعلیم، جوش، کرشن چندر، بیدی اور احمد عباس وغیرہ ہیں۔ جہاں تک "علم و فکر" کا تعلق ہے یہ دنیا جانتی ہے کہ یہ ادیب و شاعر چاہے ٹی، ایس ایلیٹ یا آندرے ژید کے مقابلہ میں کمتر ہوں لیکن پرنسپل عبدالشکور، اختر علی تلہری اور محمد احسن فاروقی جیسے نقادوں اور معلّموں سے علم و بصیرت فنی مہارت، وسعت مطالعہ اور سوجھ بوجھ میں بہت زیادہ ہیں۔ اس موقعہ پر مجھے وہ ادبی بحث یاد آگئی، جب چند سال پہلے اختر علی تلہری نے "حالی اور پیروئ مغربی" کے سلسلے میں احتشام صاحب کے خلاف ایک محاذ کھڑا کیا تھا جس میں عبدالماجد دریابادی کی قسم کے لوگوں نے اپنی یہ بات منوانے کے لئے کہ مولانا حالی نے ایران کے ایک غیر معروف صوفی شاعر مغربی کی پیروی کی تلقین کی ہے، مجنوں، احتشام اور حسرت نعمانی وغیرہ کے بارے میں کہا تھا کہ یہ لوگ جاہل اور علم سے بیگانہ ہیں، جس کا جواب دیتے ہوئے نیاز صاحب نے لکھا تھا:۔

لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

احسن فاروقی صاحب سے اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ نہیں ہے کیونکہ جن ترقی پسندوں کا انھوں نے اپنے مضمون میں بار بار ذکر کیا ہے وہ ان کی یونیورسٹی کے طالب علم معلوم ہوتے ہیں

جو فیشن کے طور پر خود کو ترقی پسند کہتے ہوں گے لیکن وہ ہوں گے یونیورسٹی کے شریر اور کھلنڈرے لڑکے۔ وہ اپنی دل لگی کے لئے اپنے محترم اُستاد ڈاکٹر احسن فاروقی کو تختۂ مشق بناتے ہوں گے اور ان کی ناروا حرکتوں سے عاجز آکر ڈاکٹر صاحب موصوف بجائے ان کو کچھ کہنے کے ترقی پسندی، ترقی پسند ادب اور شاعری پر اپنا غصہ اُتارتے ہیں اور اس جھنجھلاہٹ میں توازن اور سنجیدگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ وہی قصہ ہوا کہ کسی بڑھیا کو جو لاٹھی ٹیکتی ہوئی جا رہی تھی چند نوجوانوں نے پریشان کیا تو وہ سرے سے "نوجوانی" ہی کو صلواتیں سنانے لگی اور کہنے لگی کہ اس تندرستی اور طاقت کو آگ لگے، بچپن اور بڑھاپا زندگی میں دو ہی مرحلے ہوں تو بہتر ہے۔ اسی قسم کی ہٹ دھرمی اور چڑچڑاپن اس مضمون میں بھی نظر آتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ترقی پسند ادب وحی و الہام ہے۔ اس کے تمام اصول برحق ہیں، ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے یہاں کوئی عیب ہی نہیں یا ہر وہ نظم افسانہ یا تنقید جو کسی ترقی پسند ادیب کی تخلیق ہے کوئی بہت بڑا ادبی اکتساب ہے لیکن تنقید صرف "ہاں" یا "نہیں" کے اصول پر نہیں چل سکتی اور نہ ریاضی کے سوال کی طرح اگر جواب مقررہ ہندسوں میں نہ آیا تو پورا عمل غلط ہے۔ ادب میں یہ اُصول نہ کبھی رہا ہے اور نہ اسے ایک معقول انسان تسلیم کر سکتا ہے۔ اچھا اور برا، اعلیٰ اور ادنیٰ ادب ہر زمانے میں رہا ہے بلکہ ایک ہی ادیب و شاعر کے یہاں اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں قسم کی تخلیقات مل سکتی ہیں۔ نقاد کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کا جایزہ لے، انھیں الگ الگ کر کے دکھائے اور کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کہے اور ان تمام باتوں کے لئے دلایل اور وجوہات پیش کرے۔ احسن فاروقی صاحب اگر واقعتہً ترقی پسند ادب کو ادب نہیں صحافت ہی سمجھتے ہیں تو انھیں مطالعہ کر کے اور محنت کے ساتھ ایک مقالہ سپرد قلم کرنا چاہئے تھے۔ جس کے لئے دو اصولوں کو سامنے رکھا جاتا۔

(۱) کیا آپ ترقی پسندی کے قایل ہیں، کیا آپ بنیادی طور پر اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ زندگی آگے بڑھتی ہے اور زمانے میں جس طرح نظام تہذیب و معاشرت میں انقلابات ہوتے رہتے ہیں اسی طرح ادب میں بھی نئی نئی تحریکیں چلتی ہیں۔

(۲) کیا آپ ادب کا کوئی مقصد سمجھتے ہیں یا صرف ذہنی لذت و تعیش کا سامان سمجھتے ہیں۔ کیا مختلف ملکوں میں جو ادب مختلف زمانوں میں پیدا ہوتا رہا ہے اور آج پیدا ہو رہا ہے اس میں وہ ادب جس میں انسانیت، تہذیب، شرافت، جمہوریت، اشتراکیت وغیرہ کا پروپگنڈہ کیا گیا ہے وہ ادب ہے، یا صرف وہی تحریریں ادب میں شمار ہو سکتی ہیں جنکا کوئی مقصد نہ ہو اور جس میں انفرادی اور ذاتی جذبات کی تسکین وہی کا سامان فراہم کیا گیا ہو۔ آپ اُصولی طور پر پروپگنڈے کے مخالف ہیں یا صرف اشتراکیت کے پروپگنڈے سے ادب کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، اب اگر آپ ان دو باتوں کے قایل ہیں یعنی قدیم میں نہ تو ردوبدل ہو سکتا ہے اور نہ ادب میں مقصدیت کا اظہار ہوتا ہے تو پھر آپ کو

قدیم و جدید کے درمیان ایک لکیر کھینچی ہوگی، یعنی اس ادب کو تلاش کرنا ہوگا جو قدیم سے ذرا بھی انحراف نہ کرتا ہو اور نہ مقصد رکھتا ہوگا۔ اس سلسلہ میں احسن فاروقی صاحب کو غالباً بڑی دشواری کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ وہ جن کو قدیم ثابت کرنے کی کوشش کریں گے وہ بھی کسی نہ کسی طرح پچھلے لوگوں سے مختلف ہوگا۔ اور کسی نہ کسی صورت میں وہ کسی چیز کا پروپگنڈہ کرتا ہوا ملے گا چاہے وہ تصوف، روحانیت اور دیوی دیوتاؤں کا ہو یا انسانی ترقی کا۔ مثال کے طور پر وہ غالب ہی کو لیں گے تو وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا باغی تھا اور اس کی شاعری میں بدعت کی فراوانی بھی ہے اور کالیداس، شیکسپیر، رومی، ہومر، تلسی داس وغیرہ سب کے یہاں بھی بے مقصد اور پروپیگنڈے سے خالی ادب نہ مل سکے گا۔ اسی طرح حالی، اقبال، چکبست، جوش میں سے کسی کو احسن فاروقی صاحب اپنی کھینچی ہوئی لکیر کی حدود میں نہیں لاسکیں گے کیونکہ یہ سب ادبی ارتقا کی کڑیاں ہیں۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر احسن فاروقی صاحب اصولی اور بنیادی طور پر ان باتوں کو مانتے ہیں اور جیسا کہ وہ ایک جگہ کہتے بھی ہیں کہ "میں صحیح ترقی پسندی کا قایل ہوں" تو انھیں پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ ۱۹۳۶ء سے لیکر اب تک ترقی پسند ادیبوں نے جو کارنامہ پیش کیا ہے ان میں کتنی خرابیاں ہیں اور کتنی اچھائیاں؟ صرف خرابی اور صرف اچھائی اس سوال کا جواب نہیں ہوسکتا ہے اور اگر ہوسکتا ہے تو وہ تنقید نہیں کوئی اور چیز ہوگی، ہاں اگر تنقید کرنا مقصود ہے تو ادب کے مختلف اصناف (شاعری، ڈرامہ، افسانہ، تنقید وغیرہ) کو لیکر اور نام بنام مصنفین اور ان کی تصنیفات کا حوالہ دیکر یہ دیکھئے کہ انھوں نے کہاں تک کام کی چیزیں پیش کی ہیں اور کہاں تک ان کے یہاں کوڑا کرکٹ ہے۔ اگر اس میں کچھ چیزیں اس پندرہ سال کے عرصہ میں ایسی مل جاتی ہیں جن کو ادب کہا جاسکے یا جن سے ہماری زبان تہذیب اور قوم و ملک کے سرمائے میں اضافہ ہوا ہے تو اس ادب کے زندہ رہنے کا حق ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ گردن زدنی ہے کیونکہ بنیادی طور پر تو آپ ان اصولوں کے قایل ہیں صرف ان کی عملی صورت آپ کو نہیں ملی تو یہ کہئے کہ اس عرصہ میں ترقی پسند ادب جسے صحیح معنوں میں ترقی پسند ادب کہنا چاہئے پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں بارہا ایسے زمانے گزرے ہیں جب صدیوں تک کوئی بڑا ادیب و شاعر نہیں پیدا ہوا بلکہ وہاں ادب نے زوال کی منزلیں طے کیں۔ اگر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے واقعتاً سنجیدگی کے ساتھ قلم اٹھایا ہوتا تو وہ ایسا ہی کرتے اور ہر نقاد کو ایسا ہی کرنا چاہئے۔ اس صورت میں وہ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، فیض، راشد، مجاز، سردار جعفری، کرشن چندر، بیدی، اشک، اختر انصاری، احمد عباس، عصمت چغتائی وغیرہ اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی ادبی تخلیقات اور مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور وغیرہ کے تنقیدی کارناموں کا ایک ایک کرکے جایزہ لیتے اور لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے کہ دیکھو "ترقی پسند ادب، ادب نہیں صحافت ہے" ابھی تک ترقی پسند ادب اصل معنوں میں وجود ہی میں نہیں آیا ہے اور یہ پندرہ برس کا زمانہ

ادبی زوال کا زمانہ ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے مضمون کا اصل محرک ان کے کھلنڈرے طالبعلموں کی شرارت ہے اور اس شرارت نے ان کی آنکھوں پر اس قدر پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ چلچلاتی دھوپ میں کھڑے ہو کر کہہ رہے ہیں کہ "یہ سورج، سورج نہیں چاند ہے"۔ اب سننے والا یہ تو نہیں کرے گا کہ سڑکوں پر جا کر لوگوں سے اس قول کی تردید کرے اور کہے کہ نہیں یہ سورج ہی ہے، لیکن وہ یہ ضرور کرے گا کہ اس کہنے والے کو یہ یقین دلا دے کہ اس کی بینائی جاتی رہی ہے اسے پہلے اپنی آنکھ کے علاج کی فکر کرنی چاہئے ورنہ وہ کسی اندھے کنوئیں میں گرے گا اور اس طرح اپنی موت کا خود ہی سامان مہیا کرے گا۔

میں نے یہ مضمون اسی نقطۂ نظر کے تحت لکھا ہے ورنہ ڈاکٹر احسن فاروقی کا مضمون تو اس قدر پھُس پھُسا اور بے جان ہے کہ وہ حیات اللہ انصاری یا محمد عسکری کے مضامین کی طرح گمراہی بھی نہیں پھیلا سکتا۔ مجھے یہ مضمون لکھتے وقت ناظرین کی بھلائی مقصود نہیں بلکہ خود احسن فاروقی صاحب کو ان کے شپرہ چشم ہو جانے کا احساس دلانا ہے اور اپنے اس عمل کے جواز میں کسی ترقی پسند شاعر کا صحافتی شعر نہیں بلکہ غالب کا یہ قول پیش کرنا ہے کہ:۔

روک لو گر غلط چلے کوئی
ٹوک دو گر خطا کرے کوئی

خلیل الرحمٰن اعظمی

شامِ اَوَدھ

(ناول)

مصنفہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ام۔ اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی

جس میں بلدۂ حسن و شباب اور سرزمین نغمہ و رنگ یعنی لکھنؤ کی اس معاشرت کی دلچسپ تصویر پیش کی گئی ہے، جس پر ساری دنیا نے رشک کیا۔ اگر شاہانِ اودھ کے محل خانوں کی رنگ رلیاں، بیگموں کی زبان، لکھنوی محاورے اور مشرقی تمدن کے ڈوبتے ہوئے سورج کی شفقی رنگینی دیکھنا ہے تو اس ناول کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

حجم ۲۷۴ صفحات ۔ مجلد۔ معہ رنگین گرد پوش ۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

عالمِ خواب کی پیش گوئیاں

خواب کی غیب گوئی اور پیش گوئی اس کے ماورائی تصور کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ جو لوگ خواب کو پیام ربانی سمجھتے اور بشارت والہام و مکاشفہ کا مظہر خیال کرتے ہیں ان کے نزدیک خواب غیب کی باتیں بتاتا اور آنے والے واقعات کی خبر دیتا ہے۔ یہ نظریہ قدما کی ایک مقدس یادگار کے طور پر ابھی تک عوام میں رائج اور عزیز چلا آرہا ہے اور تمدن کی اس پست ترین منزل کا پتہ دیتا ہے جس سے ہم نے انتہائی جدوجہد کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرنا شروع کی تھیں۔ ان تمام منازل کا جنھیں نوع بشر ابتدائے آفرینش سے طے کرتی چلی آئی ہے نہ صرف کسی ایک ہی شخص کی زندگی میں پایا جانا بلکہ عوام کے دماغوں میں بھی درجہ بدرجہ اختلاف کا ملنا حیات کے نظریہ ارتقا کی تائید کرتا ہے۔ ذہنی نشوونما کے اعتبار سے نوع بشر کے جملہ افراد نہ کبھی ایک سطح پر رہے ہیں اور نہ کبھی رہ سکیں گے۔ دنیا کے مختلف افراد میں پختہ مغزوں کے ساتھ ساتھ خام طبعوں کا پایا جانا اتنا ہی فطری ہے جتنا ان کے خیالات و آرا کا اختلاف اور پھر ان کے درمیان مختلف مدارج کا شمار تو حیطۂ امکان سے باہر ہے۔

خواب پر چونکہ ایک غیبی قوت کا اقتدار ہوتا ہے اس لئے اس کی غرض و غایت کا تعین بھی اسی کا کام ہے انسانوں سے اس غیبی قوت کا تعلق خواب ہی کے ذریعہ قایم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں خواب دکھانے سے اس کی دو ہی اغراض وابستہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو ان کے ذریعہ وہ ہم کو کسی ایسی بات سے آگاہ کر دے جس کا ہمیں پیشتر سے کوئی علم نہ ہو تاکہ ہم اپنے رویے کو حصول مقصد کے پیش نظر تبدیل کر لیں اور اس طرح اس بشارت والہام وغیرہ سے فایدہ اٹھائیں یا پھر اس کی غایت ہمیں نقصان پہونچانا ہو سکتی ہے (خوفناک خواب اس کی اچھی مثال ہیں)۔ اس صورت میں یہ غیبی قوت بدی سے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ قدما کا یہ بھی خیال تھا کہ ارواح نیک بھی محرک خواب ہوتی ہیں اور ارواح بد بھی۔ بہرحال خواب کی حقیقت و ماہیت دریافت کرنے میں انھوں نے دیوتاؤں، روحوں، اور دیگر غیبی قوتوں کو جن کا انھیں کوئی علم نہ تھا وہ تمام اختیارات تفویض کر دئے جو خواب کی غرض و غایت میں صرف کئے جا سکتے ہیں۔ لامعلوم دیوتاؤں کا یہ تصور ابتدائی انسان کی جہالت کا نتیجہ ہے جس نے اپنی ہی داخلی قوتوں کو خارجی دنیا میں منتقل کر دیا اور خود ان کے سامنے مجبور محض بن کر رہ گیا۔

قدما کا یہی غلط طریق تفکر تھا جس نے خواب کو پیش گو صفات سے متصف کر دیا۔ وہ ہمیشہ ایک لامعلوم شے

کی حقیقت دوسری لامعلوم شے کے ذریعہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اور سچ پوچھئے تو یہ اصول غیر فطری بھی ہے۔ ان کی تحقیق میں باقاعدگی کا فقدان پایا جاتا ہے۔ ذہن انسانی ہمیشہ معلوم سے لامعلوم کی جانب بڑھتا ہے وہ ہر نئی شے کو تجربات محصلہ و واقفیت سابقہ کی روشنی میں دیکھتا ہے، دیکھ سکتا ہے، اور دیکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ لامعلوم کبھی بھی تحقیق کا سنگ بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ دریافت و جستجو کی عمارت کی بنیاد ناقابل اعتبار اور غیر یقینی تاریکی میں نہیں رکھی جا سکتی۔ ماضی ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس کا ہمیں علم ہے جس میں ہم رہ چکے ہیں اور جس کا ہماری زندگی کے بناؤ بگاڑ میں بہت کچھ حصہ ہے۔ مستقبل ایک ایسا التباس ہے جس پر کوئی بھی صحت مند دماغ اعتبار نہیں کر سکتا اور نہ کوئی معقول انسان اس کی امید پر اپنا کوئی نہج زندگی ہی متعین کر سکتا ہے۔ ماضی ایک روشنی ہے اور مستقبل تاریکی۔ چنانچہ ماضی کو تو شمع راہ بنایا جا سکتا ہے مگر اپنے آپ کو مستقبل کے سپرد نہیں کیا جا سکتا البتہ مستقبل ماضی کا پرتو کہا جا سکتا ہے۔ ماضی ہی کی روشنی میں مستقبل سے امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں اور ان خوابوں میں وہ حقایق دیکھے جا سکتے ہیں جو کبھی ہمارے شعور کی ملکیت رہ چکے ہیں۔

اصولِ فطرت کے مطابق انسان کا ذہن ہمیشہ معلوم سے لامعلوم کی طرف جاتا ہے لہذا قدما کو بھی یہی لازم تھا کہ وہ خواب کو ماضی سے متعلق کر دیتے اور اسی کی روشنی میں تاویلیں دیکھنے کی کوشش کرتے لیکن یہ بات آنے والے زمانے کے لئے اُٹھ رہی تھی کہ خواب کو ماضی کی پیداوار سمجھا جائے اور خرق عادات و پیش گوئی کے دُہرے لباس کو اُتار کر اسے عریاں حالت میں دیکھا جائے۔ وہ فرائڈ ہو یا کوئی اور عہد حاضر میں کوئی مفکر کوئی محقق ان بھول بھلیوں میں پھنسنا گوارا نہیں کرے گا۔ لیکن غیر تربیت یافتہ دماغ آج بھی قدما کی مقدس یادگار کے طور پر ان خیالات و نظریات کی مفارقت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کا طریق تفکر بھی قدما سے بالکل مشابہ ہے۔ آخر انسان کی فطرت تو وہی ہے۔ زمانہ بدل گیا اور آگے بھی بدلتا رہے گا لیکن انسان کی فطرت نہیں بدلی جا سکتی۔ جو انسان اس وقت تھے وہی اسوقت بھی موجود ہیں یا یوں کہئے کہ انھیں کی اولاد تو ہیں۔

فطرتِ انسانی کا اُصول ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ ہمیشہ معلوم سے لامعلوم کا علم حاصل کرتی ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ پھر بھی یہی فطرت خواب کو مستقبل سے متعلق کرنے پر مائل ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے والے وہ دماغ ہیں جو کافی تربیت یافتہ نہیں ہیں یا بالفاظ دیگر جن کی تحقیق و جستجو میں باقاعدگی اور پابندی اصول نہیں ہے۔ چاہے وہ دماغ ہمارے اسلاف کے ہوں چاہے معاصرین کے اس لئے کہ عقل، تعلیم، فطری رجحانات اور سماجی میراث انسان کی ذہنی نشوونما اور اس کی قوتِ عمل پر کافی اثر ڈالنے والے عوامل ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسانوں کے سمجھنے میں کافی اختلاف رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک اگر صحیح سوچتا ہے تو دوسرا غلط یعنی جو لوگ خواب کو مستقبل سے متعلق کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ لیکن قوانین فطرت کی یہ خلاف ورزی بے سبب بھی

نہیں ہو سکتی۔

اب اگر تعلیم و تربیت کو اصولِ فطرت کی اس خلاف ورزی کا سبب مان لیا جائے تو یکساں تعلیم یافتہ لوگوں کو اس معاملہ میں متفق الرائے بھی تسلیم کرنا پڑے گا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی وجہ خارجی ہونے کے بجائے داخلی ہی ہوگی۔ خارجی عوامل کے اثرات کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں جب تک انسان کے ذہن میں پیشتر سے اس کے موافق رجحانات موجود نہ ہوں گے ان کے اثرات ضایع ہی جائیں گے۔ لہذا ہمیں اس غلطی کا سبب فطرت انسانی ہی میں تلاش کرنا ہوگا۔ آیئے اس پر ذرا تفصیل کے ساتھ غور کریں کہ خواب اور مستقبل میں کیونکر یہ تعلق پیدا کیا گیا۔

خواب تکمیل آرزو کا دوسرا نام ہے۔ ہماری بیدار زندگی میں پیدا ہونے والی لاتعداد تمناؤں میں سے کچھ تو پوری ہو جاتی ہیں اور کچھ تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں، وجہ یہ ہے کہ حالات زمانہ ہمیشہ سازگار نہیں ہوتے۔ اکثر ایسے موقعے پیش آتے ہیں کہ ہم اپنی تمناؤں کا خون ہوتے ہوئے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ہم یہ کبھی نہیں چاہتے کہ ہماری تمناؤں کا خون ہو یا ہماری آرزوئیں تشنۂ تکمیل رہ جائیں لیکن کچھ ایسی مشکلات پیش آجاتی ہیں جو ہمارے قابو سے باہر ہوتی ہیں اور بالآخر ہمیں خاموش ہو جانا پڑتا ہے۔ یہ واقعہ ہماری بیدار زندگی کا ایک ایسا حادثۂ جانکاہ ہے کہ کبھی کبھی انسان اس کو برداشت نہیں کر پاتا اور دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ لیکن معمولی حالات میں وہ ان خوں شدہ پامال آرزوؤں کو اپنے سینہ سے لگائے رہتا ہے اور ان کی تکمیل کی کوشش کرتا ہے۔ خواب ان آرزوؤں کو پورا ہوتے دکھا کر کم از کم ہماری نصف زندگی کو تو فیمندانہ مسرت سے شگفتہ و شاداب بنا دیتا ہے اور اس طرح دماغی توازن کو برقرار رکھکر ہماری صحت مند حیات کا ضامن بن جاتا ہے۔

ہمارا ماضی بھی ہماری بیدار زندگی کی طرح ایک ٹھوس حقیقت اور ہمارے شعور کی گراں قدر ملکیت ہے۔ بیداری کی طرح اس میں بھی ہم کو کتنے ہی موقعوں پر شکستیں نصیب ہوئی ہیں۔ کتنی ہی بار ہمارے جذبۂ خود نمائی کو صدمہ پہونچا ہے اور کتنی ہی آرزوؤں کا خون ہوا ہے۔ ماضی کی ان پامال شدہ آرزوؤں کی تکمیل ہم آنے والے زمانہ میں چاہتے ہیں۔ مستقبل ہماری اس سب سے بڑی خواہش (تکمیل خواہش) کو پورا کر دیتا ہے اور اسی طریقہ سے پورا کر دیتا ہے جس طریقے سے ہم چاہتے ہیں یعنی ہمیں اپنے مقصد کے حاصل کرنے اور حصولِ مقصد کے خاطر خواہ ذرائع و وسایل اختیار کرنے میں مستقبل پوری پوری آزادی دے دیتا ہے اور اس طرح نہ صرف یہ کہ ہماری آرزوئیں ہی پوری ہو جاتی ہیں بلکہ ہماری شکستیں بھی فتوحات سے بدل جاتی ہیں اور ہمارے جذبۂ خود نمائی کو جو صدمہ پہونچا ہے اس کی بھی تلافی ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنے تخیل کو خاطر خواہ پرواز میں لانے کا موقع مل جاتا ہے اور ہم ایسی دنیا بسانے میں قطعاً آزاد اور مختار ہوتے ہیں جس میں صرف ہماری ہی آرزوئیں پوری ہوں، جس میں ہم مطلق العنانی سے حکومت کر سکیں، اور جس میں مداخلت کا نہ کسی کو حق ہے نہ اختیار۔

نہ کوئی شریک ہو نہ حصہ دار - مراد یہ کہ جو کچھ ہوں ہم ہوں، جو ہم چاہیں کریں، اور جس طرح چاہیں رہیں -

مستقبل ایک خواب ہی تو ہے جس میں ہماری ہزاروں ناکام آرزوئیں پوری ہوتی نظر آتی ہیں لیکن اس کا مواد ماضی کے ٹھوس واقعات ہی سے لیا جاتا ہے - کوئی انسان کسی وقت بھی اپنی کسی ایسی آرزو کو مستقبل سے وابستہ نہیں کر سکتا جو اس کے ماضی میں پیدا نہ ہو چکی ہو - تکمیل پا جانے والی آرزو کا خیال بھی نہ رہتا یا یوں کہئے کہ وہ آرزو ہی نہیں رہتی بلکہ میری کہلانے لگتی ہے - ہمارے پیشِ نظر تو وہی تمنا رہتی ہے جو ماضی میں پیدا ہوئی ہے لیکن اس کے حصول کی نوبت نہیں آئی - اسی کی تکمیل ہم اپنے مستقبل میں دیکھا کرتے ہیں - ہمیں جو شے ابھی تک نصیب نہیں ہوئی کاش آیندہ میسر ہو جائے - خدا اسے مستقبل میں عطا کر دے - گویا مستقبل وہ زمانہ ہے جس میں ہماری تمام خواہشات پوری ہوتی نظر آتی ہیں - ماضی میں ان کی تکمیل کی راہ میں صدہا موانع تھے لیکن مستقبل میں کوئی مزاحمت نہیں کوئی رکاوٹ نہیں - جو چاہا ملتا ہوا دیکھ لیا - لفظ "خوش آیند" اس حقیقت کی جانب کس قدر لطیف اشارہ کر رہا ہے -

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہے کہ تکمیل آرزو، تسکین خود نمائی اور آزادی تخیل کے اعتبار سے ہمارے خواب کو مستقبل سے جو مماثلت ہے وہ ماضی سے ہرگز نہیں ہو سکتی - ماضی بیداری اور شعور کی دنیا ہے اور مستقبل خواب لاشعور کی جنت - جنت شہیدوں کو آسودگی بخشتی ہے - مستقبل ماضی کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے اور خواب بیداری کی آرزوؤں کی تکمیل کرتا ہے - دوسرے الفاظ میں اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ماضی شہیدوں کی دنیا ہے اور مستقبل جنت کا خواب - یہی سبب ہے کہ انسان خواب کی پیشگوئی کا اپنے دل کو یقین دلانا چاہتا ہے اور یقین دلانے کے لئے اتفاقات محض کو ٹھوس دلایل کی صورت میں پیش کرتا ہے - اس خود فریبی کی تشریح یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے تخیل کے سہارے جینا چاہتا ہے -

اب سطور ذیل میں ہم خوابوں کی ان اقسام سے بحث کریں گے جنھیں پیشگو سمجھا جاتا ہے :-

کبھی کبھی ہماری کوئی چیز گم ہو جاتی ہے اور کافی تلاش کرنے کے باوجود دستیاب نہیں ہوتی لیکن جب رات کو ہم سو جاتے ہیں تو خواب میں وہ شے گھر کے کسی نہ کسی حصے میں رکھی ہوئی نظر آ جاتی ہے اور بیدار ہونے پر ہمیں اسی جگہ اور اسی حالت میں مل جاتی ہے جس طرح ہم نے اسے خواب میں دیکھا تھا - چیزوں کا گم ہو جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو روزانہ زندگی میں کم و بیش ہر شخص کو پیش آتا ہے - اس وقت گھر والے سبھی اس کی تلاش میں مشغول ہو جاتے ہیں اور گھر کا کونا کونا چھان مارتے ہیں - تو کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی کو کہیں مل جاتی ہے اور کبھی اس کا سُراغ ہی نہیں ملتا - آخر مایوس ہو کر اس کی جستجو ترک کر دی جاتی ہے اور سب تھک کر بیٹھ جاتے ہیں - آیندہ کسی موقع پر وہ کسی گھر والے کو اتفاق سے کسی ایسی جگہ رکھی ہوئی مل جاتی ہے جہاں اس سے پیشتر کسی کا خیال بھی نہیں پہونچا تھا یا پھر کبھی وہ کسی کو خواب میں رکھی ہوئی دکھائی دیتی ہے - آخری صورت میں لوگ اس کی باریابی کو خواب کی پیشگوئی کا نتیجہ سمجھتے ہیں -

بھول چوک ہر شخص میں کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہے البتہ کوئی زیادہ بھولنے والا ہوتا ہے اور کوئی کم۔ کوئی نام زیادہ بھولتا ہے، کوئی صورت اور کوئی چیز۔ ہر بھول جانے والی شے کو یاد رکھنے کے خلاف لاشعور میں کوئی نہ کوئی جذبہ ضرور کارفرما رہتا ہے۔ ہماری زبان و قلم کی لغزشیں بھی اسی داخلی عامل کی کارگزاری ظاہر کرتی ہیں۔ بہرحال یہاں ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ ہم کیوں کسی شے کو بھول جاتے ہیں بلکہ ہم کو تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ خواب میں جو چیز ہمیں کہیں رکھی ہوئی نظر آتی ہے وہ بیدار ہونے پر اسی جگہ رکھی ہوئی مل کیوں جاتی ہے؟ اگر ہم اس کو خواب کی پیشگوئی نہ کہیں تو اس کی تشریح کیونکر ممکن ہے؟

اس بات سے کہ ہر بھولی ہوئی چیز ہمارے تجربے میں کسی نہ کسی وقت آچکی تھی یعنی گم ہو جانے سے پیشتر ہم کو اس کا علم تھا حقیقت حال پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ہم اکثر اشیاء خود ہی رکھ کر بھول جاتے ہیں اس سے ہمیں غرض نہیں۔ غرض ہم کو صرف اس سے ہے کہ وہ چیز ہمارے گزشتہ تجربات میں شامل ہے اور تجربات مختلف عوامل کے زیر اثر شعور سے نکل نکل کر لاشعور میں ذخیرہ ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ نہ صرف گمشدہ چیز بلکہ اور بھی بہت سی اشیاء اسی طرح ہمارے لاشعور میں پہنچ جاتی ہیں۔ ہم ان بھولی ہوئی باتوں کو بہت کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ یاد نہیں آتیں البتہ خواب میں حافظہ بہت تیز ہو جاتا ہے۔ اس وقت بچپن تک کی بھولی بسری باتیں یاد آجاتی ہیں چنانچہ گمشدہ چیز بھی مع متعلقات کے خواب میں اسی حالت میں ہمارے سامنے آجاتی ہے جس حالت میں اور جہاں ہم اسے رکھ کر بھول گئے ہیں۔ ایک شخص ڈیلبوف نامی نے خواب میں اسپلینیم کا پودا دیکھا۔ جاگنے پر اس نے اس کے علم سے انکار کیا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے ایسا پودا اپنی عمر میں کبھی دیکھا ہی نہیں ہے لیکن سولہ سال کے بعد اس نے اسپلینیم کا خشک نمونہ دیکھا۔ اس کے نیچے پودے کا نام خود ڈیلبوف کے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا موجود تھا اور یہ واقعہ (تحریر نامہ) خواب دیکھنے سے دو سال قبل کا تھا۔

شیخ نجیب الدین بزغش شیرازی کو خواجہ ابو یوسف ہمدانی کی کتاب "زینۃ الحیوٰۃ" کا کچھ حصہ ہاتھ لگا لیکن نہ انھیں اس کتاب کا نام معلوم تھا نہ اس کے مصنف کا۔ وہ اسی دریافت کی فکر میں تھے کہ خواجہ صاحب نے خواب میں آکر انھیں اپنا نام بھی بتایا اور کتاب کا بھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ شیخ صاحب نے خواب سے قبل کبھی یہ دونوں نام نہیں سنے تھے یا دونوں کا علم انھیں نہ تھا یا وہ کتاب کے مواد اور اس کے اسلوب تحریر سے ناواقف تھے۔

کبھی کبھی خواب میں کوئی نئی بات دریافت ہو جاتی ہے۔ ریاضی کے سوالات کے جوابات معلوم ہو جاتے ہیں اور مشکل مسایل کا حل یا طریق کار بھی نظر آجاتا ہے۔ مشہور اشوری محقق ڈاکٹر ہلپریکٹ دو کتبوں کی تحریرات کو سمجھنے کی بہت کوشش کرتا رہا لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر خواب میں ایک شخص نے اس سے دونوں کتبوں کو ملا کر پڑھنے کے لئے کہا۔ بیدار ہونے پر اس نے ایسا ہی کیا اور کامیاب ہو گیا کیونکہ وہ دونوں کتبے دراصل ایک ہی کتبے کے دو حصے تھے۔ مشہور ماہر ریاضیات کونڈرسیٹ نے ریاضی کے اکثر دقیق مسایل خوابوں ہی میں حل کئے تھے۔

کونڈلک جس زمانہ میں امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ اکثر ایسے خواب دیکھا کرتا تھا۔ جن میں وہ یا تو کسی کے

ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتا یا اس سے کوئی مفید نتیجہ نکالتا۔ لیکن یہ مباحث وہی ہوتے تھے جن کو وہ سونے سے قبل بیداری ہی میں شروع کر چکا ہوتا تھا۔ اسی سلسلہ میں ابن خلکان کا وہ طویل خواب بھی پیش کیا جا سکتا ہے جس میں اس نے المبرّد سے ابن عبد ربیحی کی کتاب "عقد" کے حوالے سے بحث کی تھی اس لئے کہ المبرد نے ابو نواس کے چند اشعار پر بیجا تنقید کر ڈالی تھی۔

اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی مسئلہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا ہے یا اس کے متعلق وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ پاتے ہیں تو اسے اس وقت چھوڑ دیتے ہیں اور کم از کم ایک شب کا وقفہ دینے کے بعد پھر اس پر غور کر کے کوئی رائے قایم کرتے ہیں۔ اس سے ان کی یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ کوئی خواب دیکھ کر اس مسئلہ کے متعلق ہدایت یا رہنمائی طلب کریں بلکہ اس اثنا میں وہ مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ قریب قریب اس کا ہر پہلو رفتہ رفتہ سامنے آجاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دماغ کی پریشانی اور بہت سے ہنگامہائے بیداری کی شورش دور ہو جاتی ہے اور دماغ ہلکا، صاف اور تازہ ہو جاتا ہے اور یہ چیز کسی نئی بات کی دریافت، حل مسایل اور طریق کار کی تلاش کے لئے نہایت ضروری اور اہم ہے۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ بیداری کے لاتعداد ہنگامے ہماری پوری توجہ کو اپنے اندر جذب کئے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی ایک مسئلہ پر پوری پوری توجہ مرتکز نہیں کر پاتے۔ پھر یہ کہ ارتکاز توجہ سے ذہنی وسعت محدود اور چارۂ کار کی راہ مسدود ہو جاتی ہے۔ ہمارا خیال بہت سے ایسے معاملات تک نہیں پہونچ پاتا جو اس مسئلہ کے حل کرنے میں بڑی حد تک معاونت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اوقات کسی مسئلہ کا حل خود ہمارے جذباتی ہیجان کا مسئلہ بن جاتا ہے یعنی کسی مشکل کو دور کرنے کی تدبیریں سوچتے وقت ہمارے جذبات خواہ سعی و کاوش کی زیادتی سے خواہ اس مسئلہ زیر غور کی نوعیت کے اعتبار سے کچھ اس طرح اور اس وجہ مشتعل ہو جاتے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک سنگین دیوار سی کھڑی ہو جاتی ہے اور ہم اس کو عبور کرنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ جذبات کا اشتعال و ہیجان ہماری قوت استدلال و فیصلہ کو کمزور اور موازنہ و انتخاب کو ناقص و ناکارہ بنا دیتا ہے اور چونکہ واقعات مسایل پر جذبات کا کافی رنگ چڑھ جاتا ہے اس لئے ہماری وہ معلومات سابقہ اور تجربات محصلہ جن کی ایسے موقعوں پر اشد ضرورت ہوتی ہے ہمارے دائرہ شعور سے خارج ہو جاتے ہیں۔

نیند میں یہ بات جاتی رہتی ہے۔ اس وقت شعوری انتشار لاشعوری سکون سے بدل جاتا ہے گزشتہ یادیں اور پچھلے تجربے تمام کے تمام ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور موازنہ و انتخاب کے ساتھ ساتھ استخراج نتائج میں امداد کرتے ہیں۔ خواب کبھی بھی اختراعی نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی نئی بات دریافت نہیں ہوتی بلکہ وہ تو پچھلے ہی خیالات و تجربات سے کام لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر نتائج خواب میں بھی نکالے جاتے ہیں یعنی خیالات کی تکمیل خواب میں ہوتی ہے لیکن اس تکمیل کی تحریک بھی خواب میں یا خواب سے پیشتر ہی مل جاتی ہے۔ اس کی مزید تشریح کے لئے یہاں عالم بیداری کا ایک عام تجربہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

کاغذ پر یہ سطور تحریر کرتے وقت میری نظر اور توجہ قلم کی حرکت پر جمی ہوتی ہے کہ یکایک میرا بایاں ہاتھ کاغذ کے سرے کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اب جو میں اپنے بائیں ہاتھ کی حرکت سے مطلع ہوتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ صفحے کے سرے پر ایک مکھی بیٹھی ہوئی تھی جو میرے ہاتھ کے بڑھ جانے سے اُڑ گئی۔ جب یہ ظاہر ہے کہ کوئی حرکت بغیر خیال کے ظہور میں نہیں آسکتی تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ مکھی کے اُڑانے کا خیال میرے لاشعور ہی میں پیدا ہوا اور لاشعوری طور پر ہی حرکت میں تبدیل بھی ہو گیا۔ میں نہ تو اپنے اس خیال سے باخبر تھا نہ اس کے حرکت میں بدل جانے سے۔ مجھے تو اس کا علم صرف اسی وقت ہوا جب حرکت معرضِ وجود میں آچکی تھی۔ خواب کے مستخرج نتائج کا علم بھی ہمیں اپنی حیاتِ شاعرہ ہی میں ہوتا ہے یعنی بیدار ہونے پر اور اگرچہ سونے میں ہمارے اعضا غیر متحرک ہی رہتے ہیں لیکن خواب کے اندر حاصل شدہ نتائج حرکات میں تبدیل ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شب کے وقت جب ہم سونے کا قصد کرتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں کہ صبح ہمیں اپنے ایک عزیز دوست سے ملنے جانا ہے اور یہ سوچتے ہوئے ہم لیٹنے کے لئے بستر پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی اثنا میں مختلف واقعات سے متعلق مختلف خیالات تیزی سے دماغ میں گزرنے لگتے ہیں۔ خیالات کا یہ سلسلہ (جیسا کہ اس کا خاصہ ہے) آناً فاناً ہمیں کہیں سے کہیں پہونچا دیتا ہے اور ہم ان میں کچھ اس درجہ مستغرق ہو جاتے ہیں کہ اپنے گرد و پیش کی حتیٰ کہ خود اپنی بھی خبر نہیں رہتی۔ اس عالم میں ہم اپنے آپ کو کہیں جانے کے لئے طیار پاتے ہیں۔ مثلاً ہم لباس پہن چکے ہیں اور کونے میں سے چھڑی اُٹھا رہے ہیں کہ ہمیں ہوش آتا ہے اور یکایک چونک پڑتے ہیں کہ یہ آخر کہاں کی طیاری ہے۔ اس وقت غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے دوست کے یہاں جانے کے لئے طیار ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو الماری کے سامنے کھڑا ہوا پاکر سوچنے لگتے ہیں کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ غور کرنے پر یاد آتا ہے کہ ہمیں کوئی کتاب نکالنا تھی اور کبھی اس کی یاد ہی نہیں آتی اور ہم مجبور ہو کر واپس چلے جاتے ہیں۔ ان مثالوں میں تمام طیاری (کپڑے پہننا یا الماری تک آنا) یعنی تکمیل خیال لاشعوری طور پر عمل میں آئی ہے لیکن تکمیل خیال کی تحریک اس سے کہیں پہلے شعور ہی میں پیدا ہو چکی تھی اور درمیان میں حافظے سے محو ہو گئی تھی۔

امثلۂ بالا سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی ہوگی کہ جس خیال کی تکمیل خواب میں ہوتی ہے اس کو تحریک خواہ خواب (لاشعور) میں ملے خواہ خواب سے پہلے (شعور میں) مواد اس کا دماغ میں ضرور ہوتا ہے اور اسی پر استنباط دلایل و استخراج نتائج کا انحصار رہتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خواب میں کوئی نئی بات پیدا ہوتی ہے یا کوئی قوت نتائج کا استخراج یا خیال کی تکمیل کرتی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ خواب کے دوران میں دماغ خارجی دنیا سے مدد نہیں لیتا بلکہ اپنے ہی اندر سے مواد حاصل کرتا ہے اگر خواب میں کوئی اختراعی خصوصیت ہوتی تو اس کے اکثر کارنامے بیدار ہونے پر مضحکہ انگیز نہ معلوم ہوتے۔

بعض لوگ خواب میں نہایت فصیح و بلیغ تقریر کرتے ہیں یا رنگین و شگفتہ مضمون لکھتے ہیں یا بلند پایہ اشعار کہتے ہیں۔ ان کے یہ ادبی کارنامے خواب کا اعجاز سمجھے جاتے ہیں۔ انگریزی شاعر کالرج نے افیون کھا کر ایک خواب دیکھا

جس میں اس نے اپنی نظم "قبلائی خاں" طیار کی تھی۔ مشہور انگریزی افسانہ نگار اسٹیونسن نے اپنے کچھ بہترین مختصر افسانے خوابوں ہی سے حاصل کئے تھے۔ ملا محتشم کاشی کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ اپنا ہفت بند طیار کر رہے تھے ایک مقام پر شعر کا دوسرا مصرع نہ کہہ سکے۔ آخر بہت کچھ تضرع و زاری کے بعد وہ سو گئے تو خواب میں انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کو دیکھا کہ دوسرا مصرع بتا رہے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے جتنے بھی خواب ہیں وہ بیداری ہی کے خیالات کے سلسلے ہیں۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ان شاعروں یا انشا پردازوں کے ذہن میں ان ادبی کارناموں کا مواد پیشتر ہی سے موجود تھا لیکن اس حالت میں بھی خواب میں صرف ایک آدھ مصرع یا شعر ہی نظم ہو سکتا ہے یا دو ایک جملے ہی تصنیف ہو سکتے ہیں۔ پوری پوری نظمیں یا داستانیں مرتب نہیں ہو سکتیں۔

بعض خوابوں میں ہم کچھ ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جن سے مستقبل میں ملاقات ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ کچھ ایسے واقعات بھی دکھائی دیتے ہیں جو آنے والی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اس قسم کے معاملات میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ہم کو اپنے گزشتہ خوابوں کی یاد اس وقت آتی ہے جب کوئی واقعہ پیش آتا ہے یا وہ شخص یا چیز نظر آتی ہے جسے ہم خواب میں دیکھا ہوا سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے پیش گو خوابوں کی تشریح ہم تین طریقوں سے کر سکتے ہیں۔

(۱) پیش آنے والے واقعات یا نظر آنے والی چیز یا ملاقی انسان کو اپنے کسی گزشتہ خواب سے متعلق کر دینا دونوں میں مشترک ایک معمولی سی جزوی مشابہت پر منحصر ہوتا ہے۔ مثلاً ہم جس شخص سے ملاقات کرتے ہیں اس کی بڑی بڑی مونچھیں ہمیں اس شخص کی مونچھوں سے مشابہ نظر آتی ہیں جسے ہم کبھی خواب میں دیکھ چکے ہیں۔ تمام بشر میں صرف مونچھوں کی مشابہت کی وجہ سے جو نسبتاً بالکل غیر اہم اور جزوی ہے ہم ملاقی شخص کی مکمل شخصیت کو خواب میں دیکھے ہوئے آدمی کی شخصیت سمجھ لیتے ہیں اور یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہم نے جس شخص کو خواب میں دیکھا تھا وہ یہی شخص ہے۔ ہماری زندگی کا یہ واقعہ جو خواب کے عظیم الشان کارناموں میں شمار ہوتا ہے دراصل حیات شاعرہ کا ایک التباس ہے جس میں مشابہت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اختلاف کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ مشابہت معمولی اور جزوی ہوتی ہے اور اختلاف اس سے کہیں زیادہ۔ اس التباس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ذہن ہمیشہ مختلف اشیاء کے قدر مشترک کے معلوم کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کثرت میں وحدت اور انتشار میں تنظیم پیدا کر کے مختلف عناصر کو ربط و تسلسل کے ایک ہی رشتے میں منسلک کر دے۔

(۲) بعض اوقات ہم جن واقعات و اشخاص کو خواب میں دیکھتے ہیں وہ ہماری حیات شاعرہ ہی کے ماضی بعید سے متعلق ہوتے ہیں لیکن جب وہ دوبارہ سامنے آتے ہیں تو ہم ان کو اپنے خواب سے اس لئے متعلق کر دیتے ہیں کہ ہمیں بچپن کی بہت سی باتیں یاد نہیں رہتیں اور چونکہ شعوری طور پر ان واقعات و حالات کی یادیں ہمارے ذہن میں بیدار

نہیں ہو سکتیں لیکن خواب کا تجربہ تازہ تازہ ذہن میں محفوظ ہوتا ہے اس لئے ہم انھیں خواب ہی میں دیکھی ہوئی چیزیں سمجھ لیتے ہیں۔

(۳) کبھی یہ پیش آنے والے تجربات ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم نے عہدِ ماضی میں لاشعوری طور پر حاصل کیا تھا یعنی انکے نقوش ایسی حالت میں ہمارے لاشعور پر ثبت ہوئے تھے جبکہ ہم ان سے باخبر نہ تھے۔ مثلاً میری تمامتر توجہ اس وقت قلم کی جنبشوں اور الفاظ و معانی پر صرف ہو رہی ہے لیکن اس کمرے میں اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جیسے کرسی جس پر میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میز جس پر میں لکھ رہا ہوں۔ کتابوں کی الماریاں جو میرے گرد دیواروں کے سہارے رکھی ہوئی ہیں۔ کمرے کے باہر سے بھی مختلف ہیجات مجھ تک پہونچ رہے ہیں۔ ایک چڑیا چہچہا رہی ہے۔ کبوتر غٹر غوں کر رہا ہے۔ راہگیر بات چیت کرتے ہوئے گزر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر ان میں سے کسی ایک بات میں بھی کوئی پیدا ہوتی ہے تو میری توجہ فوراً تحریر سے ہٹ کر اس کی طرف مبذول ہو جائے گی مثلاً الماری کسی وجہ سے گر پڑتی ہے۔ میز کا پایا ٹوٹ جاتا ہے۔ قلم کی روشنائی ختم ہو جاتی ہے یا باہر کوئی شخص زور سے غل مچانے لگتا ہے تو میں فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں یعنی اب دوسری چیز میری توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور اس کا مجھے شعوری طور پر علم ہونے لگتا ہے۔ اس طرح تحریر جو اس وقت میرے جوئے شعور کی منجدھار میں ہے اور میری تمامتر توجہ کا مرکز ہے، تبدیلی کی صورت میں میرے حاشیۂ فکر میں پہونچ جائے گی اور میرے گرد و پیش کی کوئی ایک چیز جو اس وقت حاشیۂ فکر میں ہے جوئے شعور کی منجدھار میں آجائے گی۔

اس طرح جو چیز اس وقت مرکزِ توجہ بنی ہوئی ہے اور جس کا مجھے علم ہے صرف وہی میرے تجربے میں داخل نہیں ہے بلکہ میرے گرد و پیش کا ماحول بھی میرے اسی تجربے میں شامل ہے۔ اگرچہ مجھے اس وقت شعوری طور پر اس کا علم حاصل نہیں ہو رہا ہے لیکن اس کے ارتسامات متواتر میرے ذہن پر ثبت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی ارتسامات ہمارے لاشعوری تجربات ہیں جنھیں ہم شعوری طور پر کتنا ہی کیوں نہ سوچیں کبھی یاد نہیں آسکتے البتہ خواب جو خود بھی ایک لاشعوری عمل ہے ان ارتسامات کو ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے اور جب کبھی وہ بیدار زندگی میں سامنے آتے ہیں تو ہم ان کو خواب ہی میں پیش آنے والا واقعہ سمجھ لیتے ہیں اور اس خواب کو پیشگوئی کہہ دیتے ہیں۔

مندرجۂ بالا تینوں تشریحات ایسی ہیں کہ خواب اگر درمیان میں دکھائی نہ دے تو بسا اوقات ان واقعات کو دیکھ کر جن کا تجربہ ہم شعوری یا لاشعوری طور پر کر چکے ہیں ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ یہ ہمیں زندگی میں کبھی پیش آچکے ہیں لیکن کب، کہاں، اور کیونکر؟ ان سوالات کے جوابات دینا ہمارے لئے مشکل ہوتا ہے کیونکہ گزشتہ زندگی میں ہم ان کا صحیح صحیح مقام معین نہیں کر پاتے۔ لیکن اگر ان واقعات کے دونوں تجربات کے درمیان کوئی خواب نظر آجاتا ہے تو پھر یہ شناخت خفی آسانی کے ساتھ شناخت صریح میں بدل جاتی ہے اور ہم ان واقعات کو خواب ہی سے متعلق کر کے خواب کی پیشگوئی پر ایمان لے آتے ہیں۔

بعض لوگوں کو کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس ماحول میں جس میں وہ اس وقت اپنے آپ کو پا رہے ہیں زندگی میں پہلے

بھی کبھی رہ چکے ہیں یعنی موجودہ تجربے کے مانند تجربہ انھیں بیشتر بھی حاصل ہو چکا ہے لیکن یہ تجربہ انھیں پہلی بار کب ہوا تھا اس کا جواب بہت کچھ غور و فکر کرنے پر بھی انھیں نہیں ملتا۔ بالفاظ دیگر گزشتہ زندگی میں اس کے مقام کا تعین ان کے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ اس واقعہ کی تشریح بھی مندرجہ ذیل تینوں طریقوں پر کی جا سکتی ہے۔

(۱) ایسا تجربہ بچپن یا ماضی بعید میں پیش آچکا ہو لیکن امتدادِ زمانہ کے باعث اس کے حدوث کا وقت یاد نہیں آتا۔

(۲) موجودہ تجربہ کسی گزشتہ تجربے سے جزوی مشابہت رکھتا ہو یعنی اس کے چند اجزا کی شناخت خفی حاصل ہو گئی ہو۔

(۳) موجودہ تجربہ ان گزشتہ ارتسامات کا اعادہ ہو جو کبھی حاشیۂ فکر پر ثبت ہو چکے ہیں۔

بعض اوقات جب ہم دن میں کسی دوست یا عزیز سے ملنے کا ارادہ کرتے ہیں تو شب کو خواب میں اس سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ بیداری میں کسی کتاب کے پڑھنے کا خیال کیا اور خواب میں وہ ہمارے پیش نظر ہو گئی یعنی دن کا ارادہ خواب میں پورا ہو جاتا ہے۔ اسی زمرے میں وہ خواب بھی آجاتے ہیں جو ہمیں وقت معینہ پر جگا دیتے ہیں۔ مثلاً ہم یہ ارادہ کریں کہ ۲ بجے شب کی گاڑی سے ہم کو کہیں جانا ہے اس لئے ایک بجے اُٹھنا ضرور ہے۔ خواب ہمارے اس ارادے کو پورا کرنے کے لئے ایک ایسی داستان مرتب کرتا ہے جو ایک بجے ختم ہو جاتی ہے۔ پابندی وقت کا احساس ہمارے خواب میں برابر جاری و ساری رہتا ہے گویا پوری کہانی اسی احساس پر قایم کی جاتی ہے۔ چنانچہ ٹھیک ایک بجے ہماری آنکھ کھل جاتی ہے — کیونکہ خواب میں اگر مگر نہیں ہوتی وہ حقیقتوں سے لبریز ہوتا ہے۔

بعض خوابوں میں ان واقعات سے آگاہ کیا جاتا ہے جن کے متعلق خواب ہیں کو کوئی علم نہیں ہوتا یا یوں کہئے کہ ان پر اسے شبہ ہوتا ہے۔ یہ خواب شکوک، مغالطوں، اور پریشانیوں کے باعث نظر آتے ہیں لیکن خواب میں شک و اشتباہ نہیں ہوتا۔ وہ گمان و اشتباہ کو بھی حقیقت کے لباس میں پیش کرتا ہے مثلاً سلطان محمود غزنوی کو تین امور میں شک تھا۔ ایک تو اپنے متعلق کہ میں سبکتگین کا بیٹا ہوں یا نہیں، دوسرے حیات بعد الممات کے بارے میں کہ یہ حقیقت بھی ہے یا نہیں اور تیسرے اس حدیث کی صحت کے متعلق کہ "علما پیغمبروں کے وارث ہیں" ایک دن اس نے اپنا شمعدان ایک غریب طالبعلم کو بخش دیا تو شب کو خواب میں آنحضرتؐ کو یہ فرماتے سنا "اے امیر سبکتگین کے بیٹے! خدا تجھے دونوں جہاں میں عزت دے جس طرح تو نے میرے وارث کو عزت دی"۔ خواب کی اس خصوصیت پر غور کرنا چاہئے کہ اس نے کس طرح تینوں شکوک کو حقایق سے بدل دیا۔ واضح رہے کہ ان تینوں شکوک کے وہی پہلو زیادہ قوی تھے جن کو کثرت کی تائید حاصل تھی اور وہ کمزور تھے جن کی حمایت صرف سلطان کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خواب نے شکوک کے انھیں پہلوؤں کو حقیقت بنا کر پیش کیا جو قوی تھے۔

ابوریحان البیرونی نے اپنی عمر کے اکسٹھویں سال کی آخری شب کو خواب دیکھا "میں ہلال دیکھنے کے لئے افق پر نظریں دوڑا رہا ہوں کہ ایک آواز آتی ہے۔ چاند کو چھوڑو تم ایک سو نوے مرتبہ اس کے بیٹے ہو"۔ خود اسی کی تعبیر کے

مطابق البیرونی کو ایک سو نوے ماہ قمری اور زندہ رہنا چاہئے تھا لیکن میکڈوگل کہتا ہے کہ اس کے حساب سے اس کی عمر ایک ماہ کم رہی، میں کہتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اگر خواب پیش گو تھا تو اسے بالکل صحیح ہونا چاہئے تھا۔ اس کا تقریباً صحیح ہونا یا اندازے اور تخمینے لگانا اس کی صداقت کو مضحکہ انگیز بنا دیتا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ البیرونی ایک ہیئت داں تھا چنانچہ اس نے غالباً خواب دیکھنے کی تاریخ سے ایک ماہ قبل اپنی باقی ماندہ زندگی کا حساب لگا لیا تھا جو ایک سو نوے ماہ قمری ہوتی تھی اور اسی حساب کا خیال اسی خواب میں سنائی دیا۔ لیکن اس نے یہ حساب اگر ٹھیک ایک ماہ قبل نہیں لگایا تھا تو پھر تو اس کا حساب بھی غلط ہو جاتا ہے۔ بہرحال خواب کسی طرح بھی پیش گو ثابت نہیں ہوتا۔

آخر میں ہم ان تمام پیشگو خوابوں کی تحلیل کر کے مندرجہ ذیل نتائج پر پہونچتے ہیں:۔

(۱) ان کا مواد ہمارے ذہن میں پیشتر سے موجود ہوتا ہے جو شعوری یا لاشعوری طور پر کبھی حاصل ہو چکا ہے۔

(۲) جو خیالات خواب میں تکمیل پاتے ہیں ان کو یا تو بیداری سے تحریک ملتی ہے یا پھر خواب سے چنانچہ بحث و مباحثہ، ریاضی کے سوالات، تنقید، شاعری، خطابت، افشا پردازی اور ارادے اسی تحت میں آتے ہیں۔

(۳) شکوک، مغالطے، اور پریشانیاں خواب میں حقیقت بن کر سامنے آتی ہیں کیونکہ خواب حقایق پیش کرتا ہے اس میں اگر مگر اور شاید کی گنجایش نہیں ہوتی۔

(۴) معمولی سی جزوی مشابہت کے باعث ہمیں التباس ہو جاتا ہے اور ہم پیش آنے والے واقعہ کو کسی گزشتہ خواب سے متعلق کر دیتے ہیں۔

(۵) زندگی میں کسی تجربے کے دوبارہ پیش آنے سے قبل جب اس کے متعلق خواب دکھائی دیتا ہے تو اسے ہم اس خواب کی طرف ہی منسوب کر دیتے ہیں اس خواب کی طرف ہی منسوب کر دیتے ہیں اس لئے کہ ہمیں اس کا پہلا وقوع یاد نہیں آتا چنانچہ اس قسم کے پیشگو خواب کا حدوث دو وقوعات کے مابین اس طرح ہوتا ہے:۔

تجربہ (وقوع اول) ——— خواب ——— تجربہ (وقوع ثانی)

(۶) ان تمام امور کے باوجود بعض خواب پھر بھی باقی رہ جاتے ہیں جو بظاہر قیود بالا سے آزاد نظر آتے ہیں اور انھیں ہم اتفاقات محض کے تحت شمار کرتے ہیں۔ مثال کے لئے ذیل میں ہم دو خواب ان کی تاویلات کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ابو شجاع بویہ دیلمی نے جو سلاطین دیالمہ کا مورث ہے ایک شب کو خواب میں دیکھا کہ آگ لگی اور اس قدر بڑھی کہ شہروں پر چھا گئی اور اس کی روشنی آسمان تک پہونچی۔ ازاں بعد اس کے تین حصے ہو گئے اور انسان اس کے سامنے سجدے میں جھک گئے۔ ایک معبر نے بتایا کہ اس کے تینوں بیٹے ان آتش زدہ شہروں میں حکومت کریں گے اور جس طرح آگ آسمان تک بلند ہوئی ہے ان کی شہرت بھی اطراف عالم میں اسی طرح پھیلے گی، چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا بھی۔

۱۹۳۵ء کا ذکر ہے کہ میرے استاد محترم جناب مولانا سید ہوبر علی صاحب جعفری امروہوی نے خواب میں دیکھا کہ

نیم کے ایک سبز درخت میں آگ لگ رہی ہے اور اس کے شعلے درخت کی پھننگی سے بلند ہو رہے ہیں - میں نے تعبیر دی کہ حکومت برطانیہ کو کوئی صدمہ پہونچنے والا ہے - اس وقت تو یہ بات رفت گزشت ہوگئی لیکن اس تاریخ سے ٹھیک ایک ماہ بعد اطلاع موصول ہوئی کہ شہنشاہ جارج پنجم کا انتقال ہوگیا -

ان دونوں خوابوں کی تعبیریں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اتفاقات محض نہ تھے - کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ منجم نے ابو شجاع بویہ دیلمی کو خوش کرنے کے لئے یہ تعبیر بتائی ہو جیسا کہ ان پیشہ وروں کا دستور ہے - اب یہ حسن اتفاق تھا کہ ہوا بھی ایسا ہی - اسی طرح میں نے جو تعبیر دی تھی اسے بھی ایک اتفاق ہی سمجھنا چاہئے - میں اب بھی نہیں بتا سکتا کہ اس وقت میں نے اس خواب کی یہی تعبیر کیوں بیان کی - بہرحال دونوں خوابوں کی تاویل کا طریقہ ایک ہی ہے جس میں خوابوں کی من حیث الکل تاویل کی گئی ہے - ان کو اجزا (تشبیہات) میں تحلیل کر کے معانی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی - یہ وہی طریقہ ہے جس سے حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیرات خواب بیان کی ہیں - نہیں کہا جا سکتا کہ یہ طریقہ کہاں تک صحیح ہے اس لئے کہ اس کے اصول و ضوابط ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں اور ان کی عدم موجودگی میں اس کا استعمال بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے - چنانچہ اس وقت تک جب تک کہ اس کے قواعد و ضوابط تحقیق کے بعد منظر عام پر نہ آجائیں ایسی مثالوں کو ہم اتفاقات محض کے تحت ہی شمار کرنے پر مجبور ہیں -

سہیل بخاری (بی - اے)

مذہبی استفسارات و جوابات

یعنے

"من و یزداں" کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے :-

اصحاب کہف - معجزہ و کرامت - انسان مجبور ہے یا مختار - مذہب و عقل - طوفانِ نوح خضر کی حقیقت - مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں - یونس اور دہانِ ماہی - حسن یوسف کی داستان - قارون - سامری - علمِ غیب - وحی کی حقیقت - دعا و توبہ - لقمان - عالمِ برزخ - یاجوج ماجوج - ہاروت ماروت - حوضِ کوثر - امام مہدی - نور محمدی اور پل صراط - آتشِ نمرود - علامہ مشرقی اور قبلہ کا رخ - دعا و توبہ کی حقیقت نفس و روح - آدم اور شجر ممنوع - لفظ امی کا صحیح مفہوم - معاد وغیرہ -

ضخامت ۲۴۴ صفحات - کاغذ سفید و دبیز - قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے -

منیجر نگار لکھنؤ

اقبالؔ میدانِ حشر میں

منظر اول

منظر — (وسیع میدان ہے - وسط میدان میں چاروں جانب پردے پڑے ہوئے ہیں - پردوں کے درمیان ایک بقعۂ نور ہے - آفتاب سے کئی لاکھ گنا زیادہ روشن، چاند سے کروروں گنا زیادہ حسین — ایک روشنی، جس کے سامنے آنکھیں نہیں ٹھہرتیں — ایک نور، جو دلوں میں سما جانے والا ہے — پردے کی داہنی جانب جبرئیلؑ کھڑے ہیں - جبرئیلؑ کبھی کبھی پر تول کر رہ جاتے ہیں اور کبھی کبھی دوسروں تک کوئی پیغام لے جاتے ہیں - بائیں جانب عزرائیلؑ کھڑے ہیں - ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی ہیں، جبیں پر شکنیں ہیں - اور آنکھوں سے شعلے برس رہے ہیں - انکی بائیں جانب اسرافیلؑ، میکائیلؑ اور دیگر ملایک باادب استادہ نظر آتے ہیں - سب کے سب سروں کو جھکائے ہوئے ہاتھ باندھے ہوئے اور نظریں نیچی کئے ہوئے مجسمہ سکوت بنے ہیں — یہ بارگاہِ ایزدی ہے، دربارِ باری تعالیٰ - اس سے تھوڑی دور آگے ایک وسیع میدان ہے - اس کے ایک جانب فردوسِ بریں ہے - دوسری طرف دوزخ کی آگ کی گہری سُرخ روشنی - ان کے درمیان ایک میدان ہے - میدان اور دربارِ ایزدی کے درمیان اوپر فضا میں کچھ دیئے ٹمٹماتے ہوئے نظر آرہے ہیں - وسط میں ایک سب سے زیادہ روشن دیا ہے - یہ آفتاب ہے - اس کے داہنی جانب ذرا نیچے کو مہتاب ہے اور نیچے اور اوپر بائیں اور داہنی جانب ستارے - چھوٹے، بڑے، مدہم، روشن - بالکل نیچے کی جانب روئی کے گالے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں)

آوازِ سروش :- چودھویں صدی کی مخلوق کو حاضر کرو - آج ان کی شنوائی ہوگی - استفسار و جواب ہوں گے اور شہادتیں لی جائیں گی -

(فرشتے معاً حکم کی تعمیل میں روانہ ہو جاتے ہیں اور ایک لمحہ میں چودھویں صدی کی مخلوق وسیع میدان میں حاضر کر دی جاتی ہے)

آوازِ سروش :- انھیں ترتیب کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے -

(میدان کے ایک سرے پر چودھویں صدی کے عام مسلمان کھڑے ہیں - اس قافلہ کا رہبر ایک ایسا شخص ہے

جس کے چہرے سے خود اعتمادی عیاں ہے اور جذبۂ یقین غالب نظر آتا ہے ۔ یہ ہے اقبال ۔ اس کے بعد مُلّا اور مُلّا صفت لوگ ۔ پھر لینن اور اس کے عقیدتمند، پھر مسولینی، ہٹلر، ہیرو ہیٹو اور ان کے معتقدین۔ ان کے پیچھے ان سے مختلف، عام انسانوں سے مختلف، فرشتوں سے مختلف، خالق مطلق کی تمام دوسری تخلیقوں سے یکسر مختلف ایک عجیب مخلوق صف بستہ ہے۔ یہ ان کا سردار خوفناک مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے اور ایک زہر خند مسکراہٹ اس کے لبوں پر رقصاں ہے۔ یہ ابلیس ہے اور وہ لوگ اس کے شاگرد۔ کبھی کبھی یہ لوگ اپنے خونخوار لانبے ناخنوں سے حضرت مُلّا کے چٹکیاں لینے لگتے ہیں اور جب حضرت مُلّا استغفر اللہ پڑھتے ہیں تو یہ ہاتھ ہٹا لیتے ہیں)

آوازِ سروش :۔ ابلیس حاضر کیا جائے۔

کچھ لوگوں کی آواز:۔ لاحول ولاقوۃ الّا باللہ العلی العظیم ۔ (ابلیس اپنی جگہ سے آگے بڑھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

جبرئیل :۔ ہمدمِ دیرینہ! کیسا تھا جہانِ رنگ و بو ؟

ابلیس :۔ سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو !

جبرئیل :۔ ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو

ابلیس :۔ آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

جس کی نومیدی سے تھی سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں قنطو اچھا تھا یا لاتقنطو ؟

جبرئیل :۔ کھو دئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس :۔ دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو ؟

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو ؟

میں کھٹکتا تھا دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو !

آوازِ سروش :۔ گواہیاں گزاری جائیں۔

ستارہ :۔ باری تعالیٰ یہ جلاوطن کر دئے جانے کے بعد بھی عرشِ معلّٰی تک پہونچنے کا سعیٔ ناکام بار بار کرتا رہا۔ بارِ الٰہا ہم نے ہمیشہ تیر کی طرح اس کا تعاقب کیا۔

چاند :۔ اسے آدم سے ازلی بیر تھا ربِ سبحانی ۔ صبحِ ازل کے انکار کے بعد یہ ہمیشہ ابنِ آدم کو ذلیل کرنے کی کوششیں کرتا رہا ۔ اور ۔۔۔۔۔

ابلیس (مسکراہٹ کاٹ کر) اے خدائے کن فکاں مجھکو نہ تھا آدم سے بیر
آہ! وہ زندانیِ نزدیک و دور و دیر و زود

حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود !

یزداں :۔ کب کھلا تجھ پر یہ راز ؟ انکار سے پہلے کہ بعد ؟

ابلیس :- بعد اے تیری تجلی سے کمالاتِ وجود
یزداں :- (فرشتوں سے مخاطب ہو کر)

پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے — کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام — ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

(ابلیس کے بدن پر ہتھ اور سارے جسم میں رعشہ سا طاری ہوتا ہے اس کے سخت بال خوف سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی پہلی جگہ پر جا کر ساکت و جامد کھڑا ہو جاتا ہے)

آوازِ سروش :- مُلّا کو حاضر کیا جائے — (مُلّا چند قدم آگے بڑھ کے کھڑے ہو جاتے ہیں)
جبرئیل :- کیا تم نے عالمِ رنگ و بو میں خدا کا پیغام پھیلانے کی کوشش کی۔
مُلّا :- ہم نے مذہب اسلام کی توسیع و اشاعت و تبلیغ میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہم نے خدائے ذوالجلال کی عبادت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ہم نے قرآن کو سینوں میں رکھا۔ اسے آنکھوں سے لگایا۔ دُنیا کے چپہ چپہ کو چھان مارا۔
آوازِ سروش :- گواہیاں .....
ستارہ :- مالک کون و مکاں۔ یہ تیرا شریف بندہ ہے، تیرے احکام پر چلنے والا۔
چاند :- تیرے نام پر مر مٹنے والا۔
سورج :- تیری خاطر دنیا کی عیش پرستیوں سے منہ موڑنے والا۔
فرشتے :- (بہ یک آواز) رب کریم یہ لائق صد ستائش ہیں، تیرے انعام و اکرام و عنایات و مدارات کے مستحق۔
اقبال :- (مضطرب ہو کر بول اُٹھتا ہے)

عرض کرتا ہوں الٰہی مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت!
نہیں فردوس مقام جدل و قال و اقول — بحث و تکرار ہے مولا تیرے مُلّا کی سرشت!
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا — اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

جبرئیل :- تجھے قوم کے ان اماموں سے کیا شکایت ہے خدا کے بندے؟
اقبال :- قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!
مُلّا :- بارِ الٰہا! اس شوخ بندے نے میری ایمانداری پر ضرب کاری لگائی، میری غیرت کو ٹھیس لگائی، میرے مقام کو ذلیل کیا۔
اقبال :- (مُلّا سے مخاطب ہو کر) تری نماز میں باقی جلال تھا نہ جمال — تری اذاں میں نہیں تھا مری سحر کا پیام
پھر بھی تجھے دعویٰ ہے کہ تو ایماندار تھا

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے — کہ امیرِ کارواں میں نہ تھی خوئے دل نوازی

اور پھر بھی تو خدائے واحد کا نیک بندہ ہونے کا دعویدار ہے۔

حاضر تھے کلیسا میں کباب و مئے و گلگوں — مسجد میں دھرا کیا تھا بجز موعظہ و پند

اور تو امامت کا دعویٰ کرتا ہے؟

جبرئیل :- مگر ملائک نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ اس نے حرم کی پاسبانی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

اقبال :- ہونہہ! یہی شیخ حرم تھا جو چرا کر بیچ کھاتا تھا — گلیمِ بوذر و دلق اویس و چادرِ زہرا

اقبال کے پیچھے جو ملاؤں کے مرید کھڑے ہیں یہ یک زبان بول اُٹھتے ہیں:- یہ سچ ہے ربّ العالمین!

ہم کو تو میسر نہ تھا مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے تھا روشن!

میراث میں آئی تھی انھیں مسندِ ارشاد — زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

آوازِ سروش :- خاموش! — لینن حاضر کیا جائے۔ اشتراکیوں کا علمبردار (لینن اپنی جگہ سے آگے بڑھ جاتا ہے)

لینن :- اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات — حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے — ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

جبرئیل :- اور اب!

لینن :- آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت — میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

آوازِ سروش :- گواہیاں گزریں۔

سورج :- بارالٰہا۔ اس نے میری شعاعوں کو گرفتار کرنے کی سعی کی تھی اور کامیاب بھی ہوا تھا خداوندا۔

چاند :- مگر خدایا۔ یہ — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ستارہ :- الٰہی۔ یہ تو — ڈھونڈھنے والا تھا میری بھی گزرگاہوں کا

مگر — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اقبال :- خدائے بابرکت۔ یہ بندہ تو:-

اپنے حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا — موت تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

لینن :- اقبال۔ کیا میں نے ایک نئے اصول کی بنیاد نہیں ڈالی؟ کیا مارکس کا اصول مادی دنیا کا بہترین اصول نہ تھا؟

اقبال :- (غصہ کے لہجہ میں) تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا تھا آخر؟ خطوط خمدار کی نمائش مربّع و کجدار کی نمائش

آوازِ سروش :- علمبردار فاسیت، رہبر نازیت و رہنمائے ملوکیت حاضر کئے جائیں۔ (ہٹلر، مسولینی، ہیرو ہیٹو آگے بڑھتے ہیں)

جبرئیل :- اے نادانو! تم نے دنیا میں غریب، نادار اور مفلس عوام کے خون سے اپنے ہاتھ کیوں رنگے؟ تم خدا کے غیظ و غضب سے

کیوں نہ ڈرے ؟

مسولینی :- میں نے تو روایات برقرار رکھیں - سیاسیات افرنگ کی پیروی کی - پہلے اس نے پردۂ تہذیب میں غارتگری آدم کشی روا رکھی تھی، پھر میں نے -

جبرئیل :- کیا تیری اس تخریبی حرکت کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا ؟

مسولینی :- ہر نئی تعمیر کو لازم تھی تخریب تمام — تھی اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود!

جبرئیل :- نابکار بندے ہیرو ہیٹو! کیا تجھے خدا کے وجود سے انکار تھا کہ تو نے اپنی خدائی کا اعلان کر دیا ؟

ہیرو ہیٹو :- اس میں میرا قصور نہ تھا - میری قوم مجھے خدا مانتی تھی - یہ درجہ تو مجھے ورثہ میں ملا تھا -

جبرئیل :- کیا تو جمہوری طریقۂ کار کو ناپسند کرتا تھا ؟

ہیرو ہیٹو :- خیر تھا سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر — تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں کسا باخبر؟

جبرئیل :- ہٹلر کیا تیرا واقعی اس پر ایمان تھا کہ تیری قوم دوسری تمام قوموں سے افضل ترین و برتر ہے ؟

ہٹلر :- یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی -

جبرئیل :- (غصہ ہو کر) مگر تم تمام لوگوں نے دیکھا - رب عظیم کے قہر نے تمھاری کیا حالت کر دی - تجھے اشتراکیوں کے ذریعہ ذلیل و خوار کرا دیا - تم دنیا سے نیست و نابود ہو گئے - تمھاری ہستی ناپید ہو گئی -

مسولینی، ہیرو ہیٹو، ہٹلر :- (بہ یک آواز) ؎

کب ڈرا سکتے تھے ہم کو اشتراکی کوچہ گرد — یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو

ہم رہبران فسطائیت، ناتسیت و ملوکیت کا ایک اصول تھا جو اسلام کے بنیادی اصول کے متضاد تھا - اگر ہمارا اصول بُرا نہ ہوتا تو ہم یقینی کامیاب ہوتے، ہم ضرور فتحیاب ہوتے کیونکہ ہم مادی طاقتوں کے ٹھیکہ دار تھے

آوازِ سروش :- گواہیاں پیش کی جائیں -

ستارہ :- بارالٰہا - انھیں لوگوں کی فکر گستاخ نے فطرت کی طاقتوں کو عریاں کیا تھا -

چاند :- رب عالمین - ان کے دور استبداد میں ہوائیں، فضائیں، سمندر، اور جہاز سب انھیں کے قبضۂ قدرت میں تھے -

آفتاب :- رب تعالیٰ - انھیں لوگوں نے دنیا کو قمار خانہ بنا رکھا تھا -

اقبال :- باری تعالیٰ - یہ اپنے دور کے مادی خدا تھے -

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے — بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس!

یزداں :- (بلند آواز میں) شوخ بندے! میں آج شروع سے دیکھ رہا ہوں کہ وقتاً فوقتاً تو نکتہ چینیاں کرتا رہتا ہے - تجھے میرے معاملات میں دخل اندازی اور چون و چرا کرنے کی کیا مجال - کون ہے تو ؟

اقبال :۔ مردِ قلندر باری تعالیٰ ۔

یزداں :۔ کون مردِ قلندر ؟

اقبال :۔ جس مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش !

جبرئیل :۔ تیرا وطن ؟

اقبال :۔ درویشِ خدا مست نہ شرقی تھا نہ غربی گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند!

جبرئیل :۔ کیوں اور کیسے ؟

اقبال :۔ مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے مومن کا مقام ہر کہیں ہے

(ستارے، چاند اور آفتاب آپس میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے ہیں)

ستارہ :۔ (سرگوشی کے لہجہ میں) اگگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا ؟

جبرئیل :۔ تیری جائے پیدائش ؟

اقبال :۔ جس دیس کے بندے تھے غلامی پہ رضامند !

جبرئیل :۔ وہاں کے مسلمان ؟

اقبال :۔ مُلّا کو جو مسجد میں تھی سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا تھا کہ اسلام ہے آزاد !

چاند :۔ (چپکے سے آفتاب کو اشارہ کرکے کہتا ہے)۔ کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند !

آوازِ سروش :۔ گواہیاں پیش ہوں ۔

جبرئیل :۔ ستارو ۔ تمہارا کیا خیال ہے ۔

اقبال :۔ (جوش میں بہ آوازِ بلند) ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا ؎ وہ خود فراخیِ افلاک میں تھا خوار و زبوں

(ستارے جلدی جلدی جھپکنے لگتے ہیں)

جبرئیل :۔ تم کیا کہہ رہے ہو ؟

اقبال :۔ مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

(چاند، آفتاب اور ستاروں کی روشنی پیلی پڑ جاتی ہے)

آوازِ سروش :۔ آج کی مجلس برخواست ہوتی ہے۔ کل صرف اس شوخ بندے کو تخلیہ میں باریابی حاصل ہوگی۔ کل صرف اقبال کی شنوائی ہوگی ۔ تخلیہ ۔ مکمل تخلیہ ۔

(مجمع منتشر ہو جاتا ہے ۔ فرشتے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں)

جبرئیل رازدارانہ لہجہ میں کسی سے کہہ رہے ہیں ؎ رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر تھے ؎ تھے اس کی گفتگو کے انداز مجرمانہ

مسلمانوں کی متفقہ آواز بلند ہوتی ہے۔ سب اقبال کو مخاطب کر کے کہتے ہیں "ہم سخن کردیا بندوں کو خدا تو نے"
ابلیس، مسولینی، ہٹلر، ہیرو ہٹیو اور لینن پہاڑ پھاڑ کر اقبال کی جانب دیکھ رہے ہیں)

منظر دوم

منظر ——— (ایزدی مہمان خانہ ہے۔ چاروں جانب سلاخیں لگی ہوئی ہیں تاکہ کوئی اپنی جگہ سے ہٹ نہ سکے۔ سبھوں کے پاس اعمال نامے ہیں مختلف صدیوں کے مختلف مہمان خانے ہیں۔ مہمان خانے میں متعدد کمرے ہیں۔ ہر کمرہ میں ایک قسم اور ایک خیال کے بندے جمع ہیں۔ ہر مہمان خانہ کے اوپر فضا میں اس صدی کی (جس صدی کا یہ مہمان خانہ ہے) نایاب سے معلق ہے۔ فضا میں چاروں جانب فرشتے اور فردوس و جہنم کے نگہدار نگہداری کر رہے ہیں۔ مہمان خانوں کے ٹھیک سامنے ایک میزان ہے۔ ایک مہمان خانہ کے اوپر فضا میں کوئی چھوٹی سی گول شے لٹکی ہوئی ہے۔ یہ چودھویں صدی کا مہمان خانہ ہے اور گیند ایٹم بم۔ اس مہمان خانے کے ایک کمرے کے پاس مہتاب فرائض نگراں کی انجام دہی کر رہا ہے۔ اس کمرے میں اس صدی کے عام مسلمان قیام پذیر ہیں اقبال گاؤ سے ٹکے ہوئے فرش پر دراز ہیں اور سارے مسلمان ان کے ارد گرد بیٹھے سوالیہ نشان بنے ہوئے نظر آتے ہیں)

ایک مسلمان:۔ ہمارے اعمال ناموں کا بیشتر حصہ تو سیاہ ہے۔ ہماری آواز باری تعالیٰ تک کیسے پہونچ سکے گی۔

اقبال:۔ مری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں — غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

دوسرا مسلمان:۔ مگر حور و ملائک، مہتاب و انجم، آفتاب و فرشتے بھی تو میرے خیر خواہ نہیں؟

اقبال:۔ حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں — میری نگاہ سے خلل اس کی تجلیات میں

تیسرا مسلمان:۔ کیا خداوند کریم ہمیں فردوس عطا کرے گا؟

اقبال:۔ ہمت ہے تو کر پیدا فردوسِ بریں اپنا — بخشی ہوئی جنت سے دوزخ کا عذاب اچھا

چوتھا مسلمان:۔ کیا خدائے بابرکت ہمیں اپنی آغوشِ رحمت میں سمیٹ لے گا؟

اقبال:۔ نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے — کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

ایک مسلمان:۔ مگر اقبال۔ آج تو نے دیکھا۔ ربِ کریم مُلّا سے خوش اور تجھ سے کشیدہ نظر آرہا تھا؟

اقبال:۔ نادان مسلمانوں! کیا تمہارا اور چودھویں صدی کے مُلّاؤں کا مقابلہ ممکن ہے؟ تم مجاہد ہو، تم شاہیں ہو کیا مُلّا کو یہ فیض حاصل ہو سکے گا کہ وہ یزداں سے تخلیہ میں گفتگو کرے۔ کیا یزداں سے اسے شرف باریابی حاصل ہوگا؟ حاشاء وکلا ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور، ہے اور شاہیں کا جہاں اور

دوسرا مسلمان :۔ کل کیا ہوگا اقبال! خدانخواستہ اگر کل تو اللہ کے غیظ و غضب اور قہر و غصہ کا شکار ہو گیا تو پھر ہمارا حشر کیا ہوگا؟ ۔۔ ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔

اقبال :۔ معصوم بندو۔ تم کل کے انجام سے خوف زدہ ہو؟ یہ مقام مسرت ہے کہ کل ہمیں ہمارا مقصد حیات مل جائے گا۔ کل ہمیں زندگی جاوداں عطا ہوگی۔ کل ہم شاداں و فرحاں اپنے مقاصد میں کامیاب اپنی منزل پر پہونچ کر ایک فاتحانہ مسکراہٹ اپنے لبوں پر بکھیرتے نظر آئیں گے۔ کل ہماری اور صرف ہماری شنوائی ہوگی ——— ہمارا دوسرے بندوں سے امتیاز ہو چکا۔ ہم اشرف المخلوقات کے زمرہ میں آچکے۔ خوش ہو کہ تمھارے دیدۂ تر کی بے خوابیاں، تمھارے دل کی پوشیدہ بے تابیاں، تمھارے نالۂ نیم شب کا نیاز اور تمھاری خلوت و انجمن کا گداز رنگ لایا۔ تمھاری کاوشیں بیکار نہ گئیں۔

تیسرا مسلمان :۔ تو یہ سب کچھ قبل از وقت کیونکر ہو سکتا ہے؟

اقبال :۔ اس لئے کہ میرا یقین محکم ہے۔ میں نے حصول مقصدِ حیات کی خاطر پیہم عمل کیا ہے۔ مجھ میں پہچاننے والی آنکھیں ہیں، سوچنے والا دماغ ہے۔ بے یقینی مجھے چھو تک نہیں گئی ۔۔ مجھ میں نا امیدی کا شائبہ تک نہیں۔

سب مسلمان :۔ (بہ یک آواز) تو پھر بتا ہم کیا کریں؟

اقبال :۔ طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!

منظر سوم

دوسرا دن، وہی میدانِ حشر

منظر ——— (بارگاہِ ایزدی ۔۔ خاکی مخلوق اور ابلیس اور اس کی جماعت نہیں ہے۔ اقبال بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوتا ہے۔ چاند ستارے اور آفتاب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ ملائک کسی عبرت خیز انجام کے منتظر ہیں)

جبرئیل :۔ اقبال تیرے حضور میں حاضر ہے باری تعالیٰ۔

یزداں :۔ شوخ بندے۔ تو کل کی مجلس میں بار بار قطع کلام کیوں کر رہا تھا؟ کیا تیرے کوئی مطالبات ہیں؟

اقبال :۔ الٰہی مے وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں جو تو مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

آوازِ سروش :۔ اجازت ہے۔

اقبال :۔ جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سُن لے — خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سُن لے

آفتاب غصہ سے سُرخ ہو جاتا ہے اور چاند سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

ناز تھا طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو — بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو!

آوازِ سروش:۔ تجھے اجازت ہے۔ تو اپنی شکایات پیش کر تاکہ تیری ایمانداری اور وفاداری کی جانچ ہو سکے۔

اقبال:۔ خدایا۔ صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں — ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں،

یزداں:۔ کیا کہا؟۔ صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے

میرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا کس نے — میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے

تھے تو آبا وہ تمھارے ہی مگر تم کیا تھے — ہاتھ پر ہاتھ رکھے منتظرِ فردا تھے،

اقبال:۔ کچھ بھی ہو بارِ الٰہا:۔

خندہ زن کفر تھا احساس تجھے تھا کہ نہیں — اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے تھا کہ نہیں،

یہ شکایت نہیں تھے ان کے خزانے معمور — نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور — اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں — بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

یزداں:۔ کیا کہا؟ بہرِ مسلماں ہے فقط وعدۂ حور — شکوہ بیجا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور!

عدل ہے فاطرِ ہستی کا ازل سے دستور — مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہ تھا — جلوۂ طور تو موجود تھا موسیٰ ہی نہ تھا

(ساری نوری مخلوق متحیر و مبہوت نظر آتی ہے۔ مگر مجبور، عاجز اور ناچار۔ آپس کی سرگوشیاں جاری ہیں)

مہتاب:۔ غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں! — شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!

خورشید:۔ اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے

کہکشاں:۔ تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے؟

اقبال:۔ ہم میں حوروں کا چاہنے والا کیوں نہیں معبودِ مطلق ——— آخر موسیٰ بھی تو ہمیں میں سے تھا۔ پھر جلوۂ طور صرف موسیٰ کے لئے مخصوص کیوں؟ بارِ الٰہی۔ ہم تو وہی ہیں کہ ؎

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے — تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

یزداں :- نہیں میرے بندے نہیں، معاملات کو اُلجھاوا نہ دے۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ :-

جا کے ہوتے تھے مساجد میں صف آرا تو غریب — زحمتِ روزہ جو کرتے تھے گوارا تو غریب
نام لیتا تھا اگر کوئی ہمارا تو غریب — پردہ رکھتا تھا اگر کوئی ہمارا تو غریب
امرا نشۂ دولت میں تھے غافل ہم سے — زندہ تھی ملتِ بیضا غربا کے دم سے

اقبال :- خدایا، ہم مسلمان تو تھے — ہم تیری وحدت پر یقین تو رکھتے تھے۔ ہم تیرے قرآن کی عظمت تو کرتے تھے۔ ہم تیرے محمدؐ کے چاہنے والوں میں تو تھے۔ ہم تجھ پر اور تیری کتاب پر ایمان تو رکھتے تھے باری تعالیٰ۔

یزداں :- انجم تو کہتا ہے کہ تجھے فکرِ جہاں نہ تھی

اقبال :- اگر کج رو ہوں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو؟ جہاں تیرا تھا یا میرا؟

یزداں :- خورشید بھی تو کہتا ہے کہ لامکاں ہنگامہ ہائے شوق سے یکسر خالی تھا۔

اقبال :- اگر ہنگامہ ہائے شوق سے تھا لامکاں خالی — خطا کس کی تھی یارب! لامکاں تیرا تھا یا میرا؟

یزداں :- مہتاب کہتا ہے کہ آدم کی اولاد انتہائے زوال کو پہونچ چکی تھی!—

اقبال :- اسی کوکب کی تابانی سے تھا تیرا جہاں روشن — زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا تھا یا میرا؟

یزداں :- فردوسِ بریں؟

اقبال :- سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم؟

یزداں :- مطلب؟

اقبال :- بچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں، — جنت مری پنہاں ہے مرے خونِ جگر میں

یزداں :- وضاحت!—

اقبال :- بارالٰہا۔ میں مردِ مومن ہوں، مجھ میں تڑپنے پھڑکنے کی توفیق ہے، دل مرتضےٰ، سوزِ صدیق — باری تعالیٰ۔ میری نگہ دلنواز ہے، میں اسرارِ مرگ و حیات کا واقف کار، میری نگاہوں میں ساری کائنات — مالک کون و مکاں — میری نگہ بلند ہے، میرا سخن دلنواز، میری جاں پرسوز — اور میرے پاک پروردگار میں بندۂ مومن ہوں، مجھ میں جذبۂ عشق ہے، جذبۂ خودی اور میرے موجِ نفس کی دھار بڑی تیز ہے۔

جبرئیل :- یہ موجِ نفس کیا ہے؟

اقبال :- تلوار ہے!

جبرئیل :- خودی کیا ہے ؟

اقبال :- تلوار کی دھار ہے !

خودی تو ہے رازِ درونِ حیات — یہ خود ہی ہے بیداریِ کائنات
خودی جلوۂ مست و خلوت پسند، — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
خودی کا نشیمن مرے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے
خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید — زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

جبرئیل :- خودی شیر مولا کیونکر ہوئی ؟ جہان، زمین اور آسمان اس کا صید کیسے ہوئے ؟

اقبال :- عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

خالقِ مطلق !- عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ — عشق ہے تیرا رسول، عشق ہے تیرا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک — عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم عشق امیرِ جنود، — عشق ہے ابن السبیل اسکے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات
صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسینؓ بھی ہے عشق! — معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق،

(زوردار آواز میں) اسی لئے ربِ دو جہاں !-
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر — قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!

یزداں :- (انداز تحکمانہ مگر پیار بھرے لہجہ میں) ..... بتا تیری رضا کیا ہے ؟

اقبال :- (محبت بھری آواز سنکر جھوم جاتا ہے اور گڑگڑا اُٹھتا ہے) .....

یارب دردِ سینہ دلِ باخبر بدہ — در بادہ نشۂ را نگرم آں نظر بدہ
سلیم، مرا بجوئے تنک مایۂ پیچ — جولانگہے بوادی و کوہ و کمر بدہ
شاہین من بصید پلنگاں گزاشتی ! — ہمت بلند و چنگل ازیں تیز تر بدہ
خاکم بہ نور نغمۂ داؤد برفروز — ہر ذرۂ مرا پر و بالِ شرر بدہ

(اقبال بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو جاتا ہے)

ڈراپ سین

غلام سرور

ام-ان، رائے کی مشہور کتاب

"چین کا انقلاب و جواب انقلاب" کا ایک باب

بدیسی حملہ

سحر بنگالہ تاریخ کی مشہور چیز ہے، ایک زمانہ تک یہ سحر ادب و شاعری، سیاست و عمران سب پر یکساں چھایا ہوا تھا آسوتوش کے تعلیمی منصوبے، جگدیش چندر کے نباتاتی انکشافات، ٹیگور کے الہامات شعری، قاضی نذرالاسلام کے شاعرانہ انقلابی پیغامات، سوباس بوس، سی، آر، داس اور ام-ان، رائے کی عملی سیاسی کاوشیں بنگال کو دنیائے تمدن و تہذیب میں ترقی کے ایک بہت ہی بلند مقام تک پہونچا چکی ہیں، بنگال کی یہ بین الاقوامی شخصیتیں نہ صرف ہندوستان کی تاریخ میں اپنا ایک ابدی نقش چھوڑ گئیں، بلکہ انھوں نے دنیا کی تاریخ علم و ادب، عمران و سیاست پر ایک گہرا اثر ڈالا۔

یہ امتیاز کرنا بہت مشکل ہے کہ ان تمام عظیم الشان ہستیوں میں سب سے زیادہ کس کی شخصیت اثر آفریں ہے، آسوتوش کے تعلیمی منصوبے بنگال تک محدود تھے، جے سی بوس نے البتہ ہندوستان اور اس سے باہر بھی شہرت و قبول حاصل کیا، ٹیگور نے ایک بین الاقوامی اثر پیدا کیا ان کی شاعری میں زندگی، کائنات اور انسانیت کے عظیم الشان مسایل سے بحث کی گئی ہے ان کے شعر و ادب میں لطیف احساسات، نازک تخیلات اور بلند تصورات پائے جاتے ہیں، ٹیگور کی شاعری انسانی معراج کی ایک زبردست تمثیل ہے، نذرالاسلام کو ٹیگور کی طرح شاعرانہ معراج حاصل نہ ہو سکی، ہوا کے رخ اور شاعر کی بے لاگ آواز نے اس کی بین الاقوامی زندگی میں بالیدگی پیدا نہ ہونے دی، لیکن پھر بھی نقاد نگاہیں جانتی ہیں کہ بنگال کے اس انقلابی شاعر نے وطن کے لئے کتنی مقدس اور وقیع خدمتیں انجام دیں، سوبھاش بابو ایک عملی انقلابی تھے، ان میں ایک ہر دلعزیز ڈکٹیٹر بننے کی عظیم الشان صلاحیت تھی، آئی-ان-اے کی تحریک سے ان کی شخصیت کی امتیازی شان، ان کی غیر معمولی صلاحیت، اور بلند انسانی تصور ظاہر ہوتا ہے، جس میں فرقہ، رنگ اور نسل کو ذرا دخل نہ تھا، حالانکہ بنگال اس باب میں ذرا بدنام سا صوبہ ہے، سی، آر، داس بھی ایک آڈیل ہندوستانی تھے، وطن کی تاریخ آزادی میں ان کی شخصیت، ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ اور مولانا آزاد بڑے بڑے فرقہ وارانہ مسایل کو اس آسانی سے طے کر لیتے تھے آج ان پر سر کھپانے کے بعد بھی قابو پانا مشکل ہو رہا ہے، مگر یہ تمام ہستیاں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا

ہو چکی ہیں، ایم - ان - رائے ایک غیر فانی ایم - ان، رائے ابھی زندہ ہے، اس کی عظمتیں اب بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہیں، اور نہیں معلوم مستقبل کی بین الاقوامی تاریخ میں اس کا کیا "مقام" ہوگا، وہ بہ یک وقت سر آسوتوش کی طرح ایک علامہ دہر بھی ہے اور جی، سی بوس کی طرح سائنس کا ماہر بھی، وہ سوبھاش بوس کی طرح ایک عظیم الشان حکومت کا معمار بننے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے، اور آڈیل کے اعتبار سے وہ 'وطنی' اور 'ہندوستانی' سے بھی ایک قدم اور آگے ہے وہ اپنے استاد روحانی کارل مارکس کی طرح انسانیت کے درد میں مضطرب، اور بشریت کے وسیع تصورات میں محو ہے، وہ 'ریڈیکل' پارٹی قایم کر کے ہندوستان میں ایک زبردست انقلاب کی تخم فشانیاں کر گیا، اس کا نصب العین اقتدار حاصل کرنا نہیں رہا ہے، اور نہ کسی تحریک کے پس پردہ اس کی یہ غرض رہی ہے، وہ انسانی ذہن میں انقلاب چاہتا ہے اور اس کی تحریروں، تقریروں اور اس کی عملی تحریکوں کا بنیادی مقصد ہمیشہ یہی رہا ہے۔

رائے کی کتاب "انقلاب چین اور جوابی انقلاب" ہمارے سامنے ہے، تقریباً سات سو صفحات کی یہ ضخیم کتاب نہ صرف چین کے انقلاب کی ایک دلگداز کہانی ہے، بلکہ اس کے مذہب، عمران اور ثقافت پر بھی ایک فاضلانہ تبصرہ ہے، یہ کتاب دیباچہ، مقدمہ اور تتمہ کے علاوہ ۲۳ ابواب پر مشتمل ہے، ذیل میں اس کے چوتھے باب "بدیسی حملہ" کا سب سے پہلے اردو ترجمہ "نگار" میں شایع ہو رہا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ چین اور ہندوستان کی تاریخ کتنی ملتی جلتی ہے اور کس طرح یوروپی سامراج نے چین اور ہندوستان دونوں پر اپنی بے رحمانہ دست درازیاں کیں، ہندوستان پر پرتگالی، ڈچ، فرانسیسی، اور برطانوی حملوں، معاشی منصوبوں، چالوں اور بے رحمیوں کی غمناک کہانیاں چین کی کہانی سے کس قدر مماثل ہیں، اس کو حسن اتفاق کہئے یا تنازع للبقاء کا آخری نتیجہ، کہ ہندوستان پر ڈچ سامراج قدم نہ جما سکا، سرزمین بنگال میں اس کا لوٹ کھسوٹ، اور اس کی قزاقیاں ہندوستان کی تاریخ کا اہم باب ہیں، چین ہی کی طرح ہندوستان بھی یوروپی سامراج کا "خطہائے اثر" بنکر رہ جاتا لیکن قدرت کو منظور ہوا کہ پرتگال گوا تک، فرانس چندر نگر اور بعض سمندری علاقہ تک محدود ہو کر رہ جائے اور ڈچ میدان چھوڑ کر انڈونیشیا میں اپنی قسمت آزمائی کرنے لگے۔

ہندوستان، چین کے اس انجام سے بچ گیا، اس کی وجہ برطانیہ کی مہذب مگر جگر خراش پالیسی تھی ہندوستان اپنی پیہم قربانیوں کے نتیجہ میں آزاد ہوا — اس کی آزادی بڑی بڑی برکتیں، بڑی شان اور سربلندیاں اپنے ساتھ لاتی، لیکن سامراجی منصوبوں نے ایک ایسا سیاسی شگوفہ کھلایا، جس کی مثال چین کی تاریخ انقلاب میں بھی ہمیں ملتی ہے یوروپی سامراج برابر جاگیر دار حکمراں طبقہ کا ساتھ دیتا رہا اور اس نے اپنے مفاد کے لئے جاگیر دار حکمراں طبقہ سے ملکر جنتا کی عظیم الشان سیاسی تحریکوں، "ٹیپنگ بغاوت" باکسر بغاوت کو کچل ڈالا، کانگریس کا بھی انجام شاید یہی ہوتا ہمیشہ انگریزوں کی پالیسی یہ رہی کہ مسلمانوں کو اس سے الگ رکھا جائے اور ملک کی اس مقدس تحریک کو فنا کر ڈالا

جائے، مسلمانوں نے اس نکتہ کو سمجھ لیا تھا، شمالی ہندوستان اور مدراس میں مسلمانوں نے اپنے خون سے اس محل کی آبیاریاں کیں، انگریز اپنی اس چال میں کامیاب نہ ہوسکے، انھوں نے ایک ایسا منصوبہ نکالا، جس کے ماتحت مسلمانوں کی اکثریت آزادی کی طلبگار تو رہی، لیکن ملک کے بٹوارہ کے مطالبہ کے ساتھ، آزادی کی اس لہر کو جو مسلمانوں میں پیدا ہوچکی تھی، انگریز فنا نہیں کرسکتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنی معاشی اقتدار کے لئے ٹھیک چین کے "خطہائے اثر" والی پالیسی یہاں بھی برتی، اور ملک کا بٹوارہ کرکے اپنا معاشی اقتدار بہرحال قایم رکھا، چین پر سامراجی حملوں، یوروپی اقوام کی دست درازیوں، اور ان کے نوآبادیاتی منصوبوں کی یہ غمناک کہانی اور رائے کا اس پر فاضلانہ تبصرہ ہمیں ایک بین الاقوامی دنیائے سیاست میں لے جاتا ہے، جہاں بعض اہم سیاسی نکتے ہماری آنکھوں کی پٹیاں دور کردیتے ہیں، سکندر، تیمور اور بوناپارٹ کی فتوحات کا مقصد قومی و انفرادی شان و برتری کا مظاہرہ کرتا تھا، ایشیا و افریقہ میں چار سو برس سے یورپ و امریکہ کے جارحانہ اقدامات، کسی قومی نشان کا مظاہرہ یا سکندر و تیمور کی کہانیوں کو دہرانا نہیں ہے، بلکہ یہ عظیم الشان معاشی منصوبوں پر مبنی ہیں، یورپ و امریکہ کی نام نہاد جمہوریتوں کے سرمایہ دارانہ منصوبے، آج ایشیا اور افریقہ کو اپنی معاشی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں، ہماری آزادیاں بھی غلامی کے دردناک داغوں سے خالی نہیں۔

ایم۔ ان رائے کی یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں لکھی گئی اور دوسرے سال جرمن زبان میں شایع ہوئی، قبل اس کے کہ انگریزی نسخہ کی اشاعت کا انتظام کیا جائے، مصنف یورپ سے ہندوستان چلا آیا، اس کے بعد وہ گرفتار ہوگیا اور چھ سال تک کا زمانہ جیل میں گزارا، ۱۹۳۶ء کے آخر میں جب وہ جیل سے رہا ہوا تو مختلف اطراف سے اس سے پرزور التماس کیا گیا کہ انگریزی نسخہ کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے، کیونکہ اس اثناء میں چین میں واقعات نے ایسی ترقی کرلی تھی کہ اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی تھی، لیکن مصنف پہلے ہی سے عملی سیاسی زندگی میں اس قدر مشغول تھا کہ اس امر میں وہ وقت اور توجہ صرف نہ کرسکا، قید و بند کے ایام میں قلمی نسخہ کا کچھ حصہ ضایع ہوگیا تھا اور بقیہ حصہ مختلف مقامات میں منتشر تھا، مصنف نے ان حصوں کو جمع کیا اور جرمن نسخہ سے بہت سے ابواب کا ترجمہ کرکے قلمی نسخہ کو مکمل کیا، انھیں اسباب کے ماتحت یہ کتاب عام طور پر خواہش کے مطابق اور جیسا کہ خود مصنف کی بھی آرزو تھی، جلد شایع نہ ہوسکی۔

۱۹۲۲ء ہی سے مصنف چین کی سیاسی تحریک کے ساتھ قریبی طور پر مربوط تھا، مصنف ہی نے وہاں کمیونسٹوں میں کومن ٹنگ میں شرکت کرنے کی پالیسی کو فروغ دیا، تاکہ شہری متوسط طبقہ کے جمہوری انقلاب کی حمایت ہوسکے، بعد میں یہ پالیسی ابن الوقت لوگوں کے ہاتھوں نیچے گرگئی، جب ۱۹۲۵ء کے اواخر میں کومن ٹنگ کے لیڈروں نے کھلم کھلا انقلاب کی طیاری کے ساتھ غداری کی تو چین کی کمیونسٹ پارٹی اور وہ لوگ جو مقامی طور پر اس کی پالیسی کی رہنمائی کررہے تھے، عمرانی مسئلہ کے مردانہ وار حل میں ناکام رہے، بہانہ یہ تھا کہ اس طور سے سامراج کے خلاف متحدہ محاذ قایم رہے گا

مصنف ہی کے پہل کرنے پر بین الاقوامی کمیونسٹ نے متوسط شہری طبقہ کے جمہوری انقلاب کو ترقی دینے کی پالیسی کی صحیح کاوش شروع کی، اور اگر ضرورت ہو تو شہری متوسط طبقہ کی عین ہنگامہ خیز مخالفت کے دوران میں اس کاوش کا سلسلہ جاری رہے، بین الاقوامی کمیونسٹ کے نمایندہ کی حیثیت سے مصنف ۱۹۲۶ء میں چین گیا، اور وہ وہاں ۱۹۲۷ء کے وسط تک یعنی چینی انقلاب کے عظیم بحران کے پورے دور میں مقیم رہا، اس عہد کے مختصر واقعات اس کی کتاب "چین میں میرا تجربہ" میں چھپ چکے ہیں، وہی کہانی ذرا تفصیل سے اس کتاب کے آخری ابواب میں دہرائی گئی ہے، مصنف جب ماسکو واپس گیا تو سارے مواد کو ایک کتاب مسمی "چینی انقلاب" میں شایع کیا گیا حکومت کے محکمۂ اشاعت نے اسکو روسی زبان میں شایع کیا تھا، اس کتاب کے آخری ابواب انھیں سرکاری مواد پر مبنی ہیں، مصنف کی پہلی کتاب "چینی انقلاب" دوسری زبانوں میں شایع نہ ہوئی، ماسکو سے طلبی آئی اور مصنف نے برلن سے وہ قلمی نسخہ بھیجدیا۔

جب یہ کتاب لکھی گئی اس وقت سے ابتک چین میں بہت سے واقعات رونما ہو چکے ہیں، مفصل طور پر ان حوادث سے بحث کرنے کے لئے ایک نئی کتاب لکھنے کی ضرورت ہے، چونکہ ان واقعات نے ۱۹۲۷ء کی سقیم حالت کے متعلق مصنف کی بحث کو تقویت پہونچائی اور چینی انقلاب کے قطعی خطوط ترقی کے متعلق اس کے نظریات کی توثیق کی، اس لئے مصنف نے اس کتاب میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا، اس لئے تاریخی مواد کی حیثیت سے اس کی خصوصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، پھر بھی چینی انقلاب کی کوئی تاریخ جو اس وقت پیش کی جائے نامکمل رہ جائے گی اگر اس میں ان حالات سے بحث نہیں کی گئی جو اس کتاب کی تصنیف اور اس کی اشاعت کے دوران میں حادث ہوئے، اس کے علاوہ ان پراز واقعات برسوں کے درمیان چین میں جو تجربہ کے سبق حاصل ہوئے، وہ نہ صرف عظیم الشان فطری قدر و قیمت رکھتے ہیں، بلکہ یہ ہمارے لئے ہندوستان میں بھی عملی اہمیت رکھتے ہیں، اس لئے مصنف نے دو ابواب کا اضافہ کیا جن میں وہ واقعات مختصراً سمو گئے ہیں

یہ کتاب ہمعصر چین میں انقلابی تحریک کی تاریخ سے زیادہ حیثیت رکھتی ہے، یہ قدیم زمانہ سے چین کی عمرانی تاریخ کے وسیع خاکے پیش کرتی ہے، بہت سے عمرانی مسایل پر جو امتیازی طور پر چینی ہیں، نظری طریقہ سے بحث کی گئی ہے ایسا کرنے میں مصنف کو اس کے اسباب کے متعلق جس کو عام طور پر تمدن کہا جاتا ہے، بعض تحقیقات کرنی پڑی، اس اکتشافات نے مصنف کو اس لایق بنا دیا کہ تاریخ کے علم میں بعض خلقی نظریہ کا اضافہ کرے، ذاتی طور پر مصنف اسی کتاب کی حقیقی خوبی سمجھتا ہے، مصنف کو زیادہ تفصیل سے اکتشاف کو جاری رکھنے کا وقت نہ مل سکا، بدقسمتی سے ایک عملی سیاسی کام کرنیوالا ایسے خالص علمی کام سے محروم رہتا ہے، مصنف کا خیال ہے کہ اس کی تجاویز دوسرے لوگوں کو اس بڑے کام کے لئے راغب کریں گی، جس کو مصنف نہ کر سکا۔

جنگ چھڑ جانے کے باعث اس کتاب کی اشاعت معرض التوا میں پڑ گئی، مناسب طباعت کے انتظام اور کاغذ کی گراں قیمت کی ادایگی کے علاوہ دوسرے زیادہ سنگین غور طلب اسباب بھی تھے، قوم پرست چین جنگ میں

اقوام متحدہ کے ساتھ شامل ہوگیا چیانگ کائی شیک پر محوری اتحاد کے ایک مخالف لیڈر کی حیثیت سے فخر کیا جانے لگا، یہ کتاب دونوں کے واقعات سے بحث کرتی ہے، اور یہ ستائش کے طور پر بالکل نہیں ہے، اس کی اشاعت سیاسی دشواریاں پیدا کر دیتی، ہوسکتا تھا کہ جنگ کی کوششوں کے لئے مضرت رساں ہونے کے باعث یہ کتاب ضبط ہوجاتی غیر ملک میں بھی کسی پبلشر کو مصنف یہ کتاب بھیج نہیں سکتا تھا، جب تک اس کا قلمی نسخہ چینی امور کے سرکاری ماہر کے معائنہ کے لئے نہ بھیجا جاتا اور وہ اس کو دبا لینے کا پورا اختیار رکھتا تھا، اگر اس کو قابل احتجاج پاتا، اس لئے مصنف نے ایک یقینی خطرہ مول نہ لیا، آخر کار چینی بلبلہ پھوٹ گیا جیسا کہ اس کو ہونا ہی تھا، بدیسی صحیفہ نگاروں نے قوم پرور چین اور اس کے ہیرو کے متعلق اگلے تعریفی اور توصیفی افسانوں کے بدلے، حقیقتیں پیش کرنی شروع کیں، اب کوئی سیاسی وجہ نہ تھی کہ اس کتاب کی اشاعت کو روکا جائے، جس کتاب نے سولہ سال قبل ٹھیک وہی پیشین گوئیاں کی تھیں جو قوم پرست اور نام نہاد کمیونسٹ چین میں واقع ہو رہا ہے۔

مصنف آج بھی اس کتاب میں کسی چیز کا اضافہ کرنا نہیں چاہتے، اور نہ بعد کے واقعات کے بموجب اسکی ضرورت ہے کہ ان نظریات پر نظر ثانی کی جائے جو ۱۹۳۰ء اور پھر ۱۹۳۹ء میں ظاہر کئے گئے تھے، جبکہ آخری دو ابواب کا اضافہ کیا گیا، مصنف نے ۱۹۴۶ء میں کتاب کے ایک مختصر سے آخری حصہ میں چین کے موجودہ نتائج کے متعلق بعض حقایق قلمبند کئے ہیں یہ حقایق جو آخری باب میں پیش کئے گئے ہیں قلب میں احساس پیدا کرنے والا سبق دیتے ہیں۔

(باقی) **عبدالمالک آروی**

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی

انجیلِ انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ضخامت ۲۷۶ صفحات۔ مجلد سات روپیہ آٹھ آنے (معہ) علاوہ محصول۔ منیجر نگار، لکھنؤ

شادی بیاہ کے گیت

شادی بیاہ کے گیت دہلی کی زبان میں مبارکباد یا سہاگ گھوڑیاں کہلاتی ہیں۔ شادی کی رسوم میں مائیوں بھی بڑی اہم رسم ہے۔ کیونکہ مائیوں بیٹھنے کے بعد لڑکی میں بہت رعنائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اس موقعہ پر اپنی خوشی کے اظہار اور لڑکی کے دل بہلانے کے لئے بہت سے گیت گائے جاتے ہیں۔ منگنی کے وقت لڑکی کو سجایا جاتا ہے۔ آرایش کی تفصیلات دیکھئے:۔

لاڈلی بنو کو میں کیسے بناؤں گی ہاتھوں مہندی پیروں میں رچاؤں گی
سوہا سالو سب ہی رنگ لایو بنو کو پنھاؤں گی لاڈو کو پنھاؤں گی
سرخ لال کپڑا
سر سونے کا واری سہرا برا جے موتین موتی سے مانگ بھراؤں گی
روپ کے
لاڈلی بنو کو میں کیسے سجاؤں گی

ذیل کے گیت میں لڑکی کی نازک بدنی۔ الھڑپن۔ اسباب آرایش سے ناواقفیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ دُلہن اتنی چھوٹی ہے کہ اسے بازو بند باندھنا بھی نہیں آتا۔ اس گیت میں زیوروں کی تفصیل ملے گی جو اُردو شاعری میں مثنویوں کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

نیوں تیرے رسیلے بنو بازو بند ڈھیلے
ناک ترے مبیر سو ہے اور موتیوں کی جوڑی چُنّی تیری زیب بنّو بازو بند ڈھیلے،
ماتھے تیرے جھومر سو ہے اور ٹیکے کی جوڑی لڑیاں تیری زیب بنّو بازو بند ڈھیلے
کانوں تیرے بالیاں سو ہیں اور موتیوں کی جوڑی کھٹکے تیرے زیب بنّو بازو بند ڈھیلے
گلے تیرے چمپا سو ہے اور جگنی کی جوڑی مالا تیری زیب بنّو بازو بند ڈھیلے
باہوں تیرے نونگے سو ہیں اور اکّوں کی جوڑی جوشن تیرے زیب بنّو بازو بند ڈھیلے
ہاتھوں تیرے پہونچیاں سو ہیں اور کڑوں کی جوڑی پائل تیری زیب بنّو بازو بند ڈھیلے
پاؤں تیرے چوڑیاں سو ہیں اور کڑوں کی جوڑی پایل تیری زیب بنّو بازو بند ڈھیلے
سیجوں تیرے شال دوشالے اور تکیوں کی جوڑی بنڑا تیرا زیب بنّو بازو بند ڈھیلے
اے میری نادان بنّو بازو بند ڈھیلے

ماں کو اپنی بچّی کی کم سنی کا خیال بار بار پریشان کر رہا ہے۔ اور بچّی زندگی کی سب سے اہم منزل میں داخل ہو رہی ہے، ماں جتنی بھی پریشان ہو کم ہے۔ اس گیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہماری معاشرت میں شادی نسبتاً کم عمری میں ہو جاتی ہے۔ معاشرت کے اس کمزور پہلو کو ذیل کے گیت میں اور بھی واضح طور پر ظاہر کیا گیا ہے۔ منگنی کے موقع پر دولھا آیا ہے، سمدھی، سمدھنیں اور دوسرے رشتے دار دولھا اور دولھن کی آیندہ زندگی کا اسٹیج تیار کر رہی ہیں لیکن اس ڈرامہ کے ہیرو اور ہیروئن اس تمام ہڑبونگ سے بے خبر اپنا کھیل الگ کھیل رہے ہیں۔

کیا ذرا سا بانٹرا ڈیوڑھی سے لاگا
آپ تو کھیلے گیند چکیاں
اماں میرے کھیلن کی گڑیاں ——— بانٹرا لے بھاگا
آپ تو کھیلے گیند رہی بلا
اماں میرے کھیلن کی گڑیاں ——— بانٹرا لے بھاگا
اماں پوچھیں بیٹی سے تیرا کیا لے بھاگا
اماں میرے کھیلن کا جھنجھنا ——— بانٹرا لے بھاگا

دُلھن کی کم عمری کہیں تو حقیقی ہوتی ہے اور کہیں نفسیاتی۔ ماں کو اپنی بچّی ہمیشہ نادان ہی نظر آتی ہے اور اسے دوسروں کے سپرد کر دینے میں جو تامل ہوتا ہے وہ اسے ہمیشہ باپ سے برسرِ پیکار رکھتا ہے، ماں کیسے کیسے بہانے پیش کرتی ہے۔

بنّو ہے نادان سیانی ہونے دو
کھانی نہ جانے پینڈیاں لاڈو میری باندھے نہ جانے بند ——— سیانی ہونے دو
باوا نے کس دیا ڈولا۔ اماں بی بی جانے نہ دے ——— سیانی ہونے دو
بنّو ہے نادان سیانی ہونے دو

ماں کے دل میں جب یہ اندیشے ہیں تو پھر بچّی کو اس زندگی میں کتنے کچھ خطرات نظر نہ آتے ہوں گے۔ اتنے میں بارات آتی ہے دولھا اس میں سب سے نمایاں ہے۔ 'بارات آگئی' بارات آگئی کا شور اُٹھا۔ دُلھن کا دل دھک سے ہو گیا نہ معلوم اس نئے شخص کے دل میں میرے لئے بھی کوئی تمنا ہے یا نہیں۔ اس ذہنی کشمکش میں ہے کہ اس کے کانوں میں اس گیت کے سریلے بول پڑتے ہیں:۔

میرا جھنک مُنک بر آیا ری ——— بڑی دوروں سے بنڑا آیا ری
اپنے دادا ابا کا گھوڑا لایا ری ——— بڑی دوروں سے بنڑا آیا ری
اپنی اماں کا ڈولا لایا ری ——— بڑی دوروں سے بنڑا آیا ری

دُلھن اطمینان کا سانس لیتی ہے کہ اگر تمنا نہ ہوتی تو دور دراز سے سفر کی تکلیفیں کیسے برداشت کرتا۔ کیا اپنے

گاؤں میں یا قریب میں لڑکیوں کی کمی تھی۔ اسے اطمینان ہو جاتا ہے۔ اتنے میں بارات شامیانے کے نیچے قرینے سے بیٹھ جاتی ہے۔ کوٹھے پر چڑھی ہوئی کھڑکی اور کواڑوں سے جھانکتی ہوئی سہیلیاں براتیوں میں سے ایک ایک کو پہچانتی جاتی ہیں سب کی سب دولھا کو نہ معلوم کن کن زاویوں سے دیکھ رہی ہیں۔ دولھا کے ابا بھی ہیں اور اس کے بھائی بھی ہیں۔ ایک طرف دُلہن کو بتایا جاتا ہے کہ دولھا بہت خوبصورت ہے، دوسری طرف دولھا کی تالیف قلب کیجاتی ہے:

بنّا بنڑی کے لئے سبھ گھڑی آیاری بنا یہ میرا ہریالا بنا یہ مرا دوں پایا بنا
بنڑا بنڑی کے لئے سبھ گھڑی آیاری بنا
ایک تو بنا بنا اور بنے کے باوا بنے چل کے دیکھو ری سکھی سب میں سہاتا ری بنا
بنڑا بنڑی کے لئے سبھ گھڑی آیاری بنا
ایک تو بنا بنا اور بنے کے بھائی بنے سیجیں مخمل کی بچھیں تکئے مشجر کے لگے
بنڑا بنڑی کے لئے سبھ گھڑی آیاری بنا
دور سے آیاری بنا راج دلاراری بنا بنڑا بنڑی کے لئے نت گھڑی آیاری بنا
بنڑا بنڑی کے لئے سبھ گھڑی آیاری بنا

اگر صرف دولھا کی تعریف ہوتی تو کچھ مضایقہ نہ تھا برات میں دولھا ہی سب کا جاذب نظر ہوتا ہے، لیکن دولھا کے بھائی اور باپ کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ چلتے چلاتے ان کی تعریف بھی کر دی جاتی ہے۔ دولہا کے لئے سہرا دُلھن کے گھر سے آتا ہے اور نکاح کے وقت باندھا جاتا ہے نکاح کے بعد عموماً مردوں میں سہرے پڑھے جاتے ہیں۔ ہماری شاعری مبارکباد اور سہرے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ آسمان سے بھی تارے لاکر سہرے میں ٹانک دئے جاتے ہیں۔ فرشتے۔ حوریں ان سہروں کو گوندھتی ہیں۔ مالن بھی گوندھتی ہے لیکن وہ مالن بھی آسمانی فضاؤں کی ہوتی ہے۔ اس کا ہماری زمین سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن گھر کی چہار دیواری میں آیئے تو آنکھیں کھل جاتی ہیں:۔

ہریالے ہمارے بنّے کے لئے سہرا گندھ لا موری مالنیاں
بیلے چنبیلی کی کلیاں سہرا گندھ لا موری مالنیاں
آؤ موری مالن بیٹھو مورے آنگن کر سہرے کا مول
سات لکھ سہرے کا مول اس کی عطر میں بسی لڑیاں
ہریالے ہمارے بنّے کے لئے سہرا گندھ لا موری مالنیاں

مالن آسمان سے نہیں آئی۔ جانی پہچانی مالنیاں ہے۔ ہندوستان پھولوں کی کلیاں ہیں، سماج کی طبقاتی تقسیم سے نفرت کرنے والی عورت اسے 'موری مالن' کہکر پیار و محبت سے آنگن میں بٹھاتی ہے اور سہرے کا مول تول شروع ہو جاتا ہے۔

نکاح کے بعد دولھا گھر میں آتا ہے اسوقت اس کا کسی سے پردہ نہیں ہوتا، تمام لڑکیاں اور عورتیں دولھا کو گھیر لیتی ہیں۔ دولھا دُلھن آمنے سامنے بٹھائے جاتے ہیں۔ صوفیوں نے تو اس سے روح اور خدا کے وصال کا استعارہ کیا ہے اور گھونگھٹ کے پٹ کھولنے پر پیا کے درشن کا مژدہ سُنایا ہے۔ لیکن گوشت و پوست سے بنے ہوئے انسانوں کے لئے بھی مسرت کا آخری سین ہے۔ یہ رسم آرسی مصحف کہلاتی ہے۔ دولھا دُلھن کے اوپر ایک سُرخ ڈوپٹہ ڈالدیا جاتا ہے کلام مجید اور ایک آئینہ بیچ میں رکھا جاتا ہے۔ دولھا سورۂ اخلاص پڑھکر دُلھن کے منہ پر دم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آنکھیں کھولو۔ دُلھن کو سہیلیاں پہلے سے سکھا پڑھا دیتی ہیں وہ کیوں کھولنے لگی جب تک یہ نہ کہلوالیں "بیوی غلام حاضر ہے آنکھیں کھولو"

میری ہریالی گھونگھٹ کھول، راج دُلاری گھونگھٹ کھول
گھونگھٹ کھولو مکھ سے بولو میری ہریالی گھونگھٹ کھول
بابا کی پیاری گھونگھٹ کھول اماں کی دُلاری گھونگھٹ کھول
ایک لکھ دوں گا گھونگھٹ کھول دو لکھ دوں گا گھونگھٹ کھول
میری ہریالی گھونگھٹ کھول

سونے کی ڈنڈی روپے کے پلڑے بیٹھی ہے جوبن تول،
گھونگھٹ اُٹھا مکھ دیکھ بنے کا بنا پایا انمول نوشہ پایا انمول
میری ہریالی گھونگھٹ کھول
دولت سے ترا گھر بھر دوں گا بچّوں سے بھری تیری گود
میری ہریالی گھونگھٹ کھول

مندرجہ بالا گیت میں راج دُلاری - اک لکھ - دو لکھ - سونے روپیہ نوشہ اور دولت کا تذکرہ ہے۔ لیکن آرسی مصحف کا ایک ایسا بھی گیت ہے جس میں دولھا دولت کے بل پر نہیں صرف اپنی محبّت کے زور پر بیباکانہ گھونگھٹ کھلواتا ہے:-

ہریالے بنے مورے نیہر مت آؤ نیہر بسے بابل مہارا ج
ہریالی بنو نیہر آؤں سو بار بُلبُل میرا سہرا بنے آج،
ہریالے بنے مورے آنگن مت آؤ آنگن بیٹھی سکھیاں کریں لاج
ہریالی بنو آنگن آؤں سو بار سکھیاں موری سالیاں بنے آج
ہریالے بنے مورا گھونگھٹ مت کھول گھونگھٹ لگے موتیا پکھراج،
ہریالی بنو کھولوں گھونگھٹ سو بار گھونگھٹ مورا جھنجھنا بنے آج

پہلا گیت امیر اور خوشحال گھرانوں کا ہے، دوسرا غریب گھرانے کا ہے، وہاں دُلہن میں تمکنت ہے اور یہاں دُلھن سوال جواب

سے نہیں کتراتی۔ کبھی اپنے باپ کا خوف دلاتی ہے۔ کبھی سکھیوں کی موجودگی کی وجہ سے شرم کرنے کو کہتی ہے مگر وہ اسکے سسر اور سالیاں ہیں خوف اور شرم کس کا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بہانہ گھونگھٹ میں موتیوں اور پکھراج کا ٹکا ہونا ہے۔ وہ سمجھی کہ شاید جواہرات کے نام سے ڈر جائے اور گھونگھٹ کو ہاتھ نہ لگائے۔ لیکن شوق کی فراوانی کو وہ بھی نہ روک سکے۔ نام سنا تھا قیمت اور اہمیت سے کیا واقف۔ اس کے نزدیک جواہرات جھنجھنے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

شادی خوشی کی مترادف ہے اور رخصت کے وقت تک واقعی وہ چہل پہل رہتی ہے کہ کسی کو بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ رخصت کے وقت یہ جذبات یک لخت بدل جائیں گے۔ شادی کے گیتوں میں رخصتی یا منڈھے اور بابل کے گیت نہایت اہم ہوتے ہیں کیونکہ ان کی المیت ہمیں تاثر اور گداز کی گہرائیوں تک لیجاتی ہے جہاں صرف جذبات کا راج ہے، ایک طرف ماں باپ اپنے جگر گوشہ سے قریب قریب بالکل جدا ہوتے ہیں دوسری طرف لڑکی اپنے ماں باپ بھائی بہن سہیلیوں اور ملنے والیوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر شاید ہی کوئی آنکھ ایسی ہو جو پرنم نہ ہو جاتی ہو۔ کالیداس نے شکنتلا کے چوتھے ایکٹ میں بیٹی کی جدائی کے نظارہ کو اسٹیج پر بڑے فطری جوش سے پیش کیا ہے۔ اردو میں المیہ شاعری نے یا تو مرثیہ کی شکل اختیار کی ہے یا ڈرامہ کی۔ لیکن ان دونوں میں داخلی عنصر نہیں پایا جاتا اور شاعرانہ بلند پروازیاں اسے عوام کی سمجھ سے ماورا لے جاتی ہیں۔ علاوہ اس کے ٹریجیڈی کا انحصار زیادہ تر ہیرو یا ہیروئن کے قتل یا خودکشی پر ہوتا ہے حالانکہ ایک شخص کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آسکتے ہیں جو موت سے زیادہ دردناک تاثرات اپنے اندر رکھتے ہیں اور ایک شخص زندہ رہ کر بھی اپنی زندگی ایسے حالات کے تحت بسر کر سکتا ہے جس میں موت سے زیادہ دردانگیزی اور مایوسی پائی جاتی ہو اس سلسلہ میں بابل اور برہا (جدائی) کے گیت خاص چیز ہیں۔ (باقی)

بسم اللہ بیگم

غزل :۔ اسد بھوپالی

غمِ حیات سے جب واسطہ پڑا ہوگا
مجھے بھی آپ نے دل سے بھلا دیا ہوگا

کسی کا آج سہارا لیا تو ہے دل نے
مگر یہ دور بہت صبر آزما ہوگا

سنا ہے آج وہ چپ چپ سے تھے اُداس سے تھے
کوئی خراب وفا یاد آگیا ہوگا

جدائی عشق کی تقدیر ہی سہی، غمخوار!
مگر نہ جانے وہاں اُن کا حال کیا ہوگا

بس ایک نعرۂ رندانہ ایک جرعۂ تلخ
پھر اسکے بعد جو عالم بھی ہو نیا ہوگا

اسد چلو کہ بدل دیں حیات کی تقدیر
ہمارے ساتھ زمانے کا فیصلہ ہوگا

آئندہ جنگ کی طیاریاں

کس قدر عجیب بات ہے کہ پچھلی لڑائی کے زخم خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ آئندہ جنگ کی طیاریاں شروع ہوگئیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ جنگ امن و سلامتی قایم کرنے کے لئے لڑی جاتی ہے، لیکن جب لڑائی ختم ہوگئی تو پتہ چلا کہ امن و سکون تو شاید ہمیشہ کے لئے دفن کر دئے گئے ہیں — اس وقت دُنیا کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے دنگل میں دو پہلوانوں کی آمد کا انتظار ہو اور بغیر تعیین وقت وہ اکھاڑے میں آنے والے ہوں — ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں دُنیا کیونکر اپنے کاروبار میں لگ سکتی ہے۔ ہر وقت کھٹکا لگا ہوا ہے کہ معلوم نہیں کس لمحہ میں آگ اور خون کا یہ کھیل شروع ہو جائے۔ یہ دو پہلوان روس اور امریکہ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ آج نہیں تو کل ان دونوں کو میدان میں آنا ہے اور دونوں طرف پوری قوت کے ساتھ طیاریاں ہو رہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ روس جو کچھ کر رہا ہے اس کا علم بہت کم ہے، کیونکہ نہ وہ خود اس کو ظاہر کرتا ہے اور نہ کوئی وہاں کے صحیح حالات سے واقف ہو سکتا ہے، برخلاف اس کے امریکہ صاف صاف بتا رہا ہے کہ وہ روس کے مقابلہ کے لئے کیا کیا طیاریاں کر رہا ہے اور مقصود زیادہ تر یہ ہے کہ روس اس سے مرعوب ہو جائے۔

چنانچہ حال ہی میں ولیم براڈفورڈ ہوئی نے جو امریکہ کی ہوائی قوت کا بڑا واقف الحال شخص ہے، اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ:- اس وقت دُنیا قیام امن و سکون کے لئے ایٹری چوٹی کا زور لگا رہی ہے، لیکن اگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئی تو پھر امریکہ اپنی تمام آٹمی قوتوں کے ساتھ سامنے آئے گا اور ایسی زبردست طیاری کے ساتھ کہ روس کے تمام بڑے شہروں کو پہلے ہی حملہ میں جلا کر خاک سیاہ کر دیا جائے گا۔ نقشے بن چکے ہیں، بمباری کے راستے متعین ہو چکے ہیں سیکڑوں ہوائی جہاز بموں سے لدے ہوئے ہر وقت طیار رہتے ہیں اور اگر روس نے امریکہ یا دُنیا کی کسی آزاد قوم پر حملہ کیا تو پھر روس کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ کھلی ہوئی ہلاکت کی دعوت دے رہا ہے — پچھلی دو جنگوں میں حملہ آوروں کو صحیح علم نہ تھا کہ امریکہ کیا کر سکتا ہے ورنہ شاید وہ لڑائی کی ہمت نہ کرتے، اس لئے اب لڑائی چھیڑنے سے قبل اسٹالن کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ اگر اس نے مغربی یوروپ کو ہضم کرنے کی کوشش کی تو وہ اس میں اپنی برّی فوجوں کی مدد سے کامیاب نہیں ہو سکتا ۱۹۴۵ء میں ہروشیما پر جو آٹمی بم گرایا گیا تھا اس نے بیک وقت ۶۶ ہزار انسانوں کو ہلاک کیا تھا، لیکن وہ بالکل ابتدائی قسم کی چیز تھی۔ اب ۱۹۴۸ء میں بمقام ایٹوٹوک جو تجربہ کیا گیا تھا اس سے معلوم ہوا کہ پچھلے تین سال میں امریکہ نے آٹمی بم بنانے میں بڑی ترقی کی ہے اور اس وقت کے بم ۱۹۴۵ء کے بم کے مقابلہ سیکڑوں گنا زیادہ قوی ہیں۔ اور

ایسا ہونا چاہئے کیونکہ پچھلے تین سال میں سیکڑوں سائنس داں اور ہزاروں ماہرین فن رات دن اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور ایٹمی بم کے علاوہ دوسرے آلات حرب بھی طیار کر رہے ہیں۔

کمیونسٹ جماعت کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ امریکن بمبار اول تو روس کی دور دراز سرزمین تک پہونچ ہی نہیں سکتے اور اگر انھوں نے ایسا کرنا بھی چاہا تو ان کے بم ٹھیک نشانہ پر نہ گریں گے، اس کے علاوہ روسی طیارہ شکن توپیں انھیں راستہ ہی میں گرادیں گی۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ امریکہ میں اس وقت ۵۰ ہزار ہوا باز اور ۳۶۰ بہترین قسم کے بمبار جہاز ہر وقت طیار رہتے ہیں اور یہ اتنی زبردست ہلاکت آفریں قوت ہے کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر آج روس حملہ کردے تو صرف چند گھنٹوں کے اندر پانچ ہزار کی مسافت طے کرکے ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی سے بمباری شروع کرسکتے ہیں۔ روس کو خبر نہیں کہ روس کے ہر بڑے شہر، ہر صنعتی ادارے اور ہر فوجی اڈے کی جائے وقوع اور وہاں تک پہونچنے کے راستے بمباروں کے علم میں ہیں اور راتوں کو جب سارا امریکہ اور روس سوتا رہتا ہے، یہ بمبار ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی سے اپنے نشانوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت جو بمبار طیار ہیں انھیں B-29 کہتے ہیں۔ پچھلی جنگ میں جرمنی پر جن بمباروں نے حملہ کیا تھا وہ بہت چھوٹے تھے اور انھیں B-17 اور B-24 کہتے تھے، لیکن B-29 قسم کے بمبار اُن سے بہت زیادہ قوی ہیں اور آیندہ دو سال کے اندر اس سے زیادہ قوی بمبار (B-36) - (B-50) اور طیار ہوجائیں گے۔

اس وقت مغربی یورپ میں ۹۰ بمبار B-29 قسم کے ہر وقت طیار رہتے ہیں جن کی قوت ۷۹۲۰۰ B-17 قسم کے بمباروں کے برابر ہے۔ جس تیزی کے ساتھ یہ کام کرسکتے ہیں اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حال ہی میں جب امریکہ نے ان بمباروں کا ایک دستہ یورپ بھیجنے کا فیصلہ کیا تو لوگوں کا خیال تھا کہ دس دن سے قبل اس کا انتظام نہ ہوسکے گا، لیکن حکم صبح کو پہونچا اور دوپہر تک پورا دستہ انگلستان پہونچ گیا۔

الغرض یہ ہیں امریکہ کی طیاریاں روس کے خلاف جن کا وہ پروپاگنڈا صرف اس لئے کر رہا ہے کہ روس جنگ کی ہمت نہ کرسکے اور مغربی یورپ سے اس کا اثر کم ہوجائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اشتراکی اثرات دُنیا میں صرف روس کے اشارہ سے پھیلتے جارہے ہیں اور اگر اس کا ذمہ دار روس ہی کو قرار دیا جائے، تو کیا وہ اپنی حفاظت کی طرف سے بالکل غافل ہے اور وہ امریکہ کی ان طیاریوں کے مقابلہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوگا۔

امریکہ کی یہ پالیسی ایک حد تک صحیح ہے کہ اس قسم کے اعلانات سے روس کو ڈرایا جاسکتا ہے، لیکن شاید اشتراکی تحریک کو نہیں دبایا جاسکتا، جبکہ خود امریکہ اور یورپ میں بھی یہ تحریک آہستہ آہستہ وسیع ہوتی جارہی ہے۔

ہاں، اگر امریکہ اس کے لئے طیار ہے کہ وہ خود اپنی آبادی کو بھی ایٹمی قوت سے ہلاک کردے اگر کسی وقت وہ کمیونسٹ ہوجائے، تو بیشک اس کا یہ پروپاگنڈا کوئی معنی رکھتا ہے، ورنہ یوں بالکل بے نتیجہ بات ہے۔

انتخاب کلام حسرت استاد جرأت

مست میں تو ہو گیا تیری نگہ سے ساقیا
اب نہیں مجھ میں رہا ہے اور پیمانے کا ہوش

آخر تیرے غم میں مر گئے ہم
بھرنا تھا جو دُکھ سو بھر گئے ہم

کس کس طرح سے ہم نے کیا اپنا جی نثار
لیکن گئیں نہ دل سے ترے بدگمانیاں

جو بیتابی دل عشاق کی باطل سمجھتے تھے
مرے سینے پہ آکر ان دنوں وہ ہاتھ دھر دیکھیں

فلک سے تو نہیں امید جو اسکو دکھا دیوے
مگر حسرت خدا چاہے تو ہم بار دگر دیکھیں

ہوے ہم بت کے بندے برہمن سے راہ کرتے ہیں
حرم کے رہنے والو تم سے عشق اللہ کرتے ہیں

دشت میں کر چلنے کی تدبیر ہونا ہو سو ہو
توڑ دیوانے تو اب زنجیر ہونا ہو سو ہو

موت آجائے کہیں اس دلِ شیدائی کو
روز سمجھائے کہاں تک کوئی سودائی کو

آتی ہیں بات بات پر ہر دم
رنجشیں درمیان کیا کیجئے

نہ جانے کیا تجھے اُلفت تھی گل سے اے بلبل
کہ اپنے جی سے گئی پر چمن سے تو نہ گئی،

یہی بھلا ہے کہ تجھ کو مرا خیال نہ گزرے
کہ شاد ہے تری خاطر کہیں ملال نہ گزرے

ٹپکنے دے مجھے سر اس کے آستانے سے
خبر کروں ہوں میں اپنی اسی بہانے سے

سراغ پوچھوں میں کیا اشک و آہ کا دل سے
کہ اس دیار سے ہو کتنے قافلے نکلے،

جگر کے زخموں کو جانا تھا بھر چلے حسرت
خراش ناخن غم سے وہ سب چھلے نکلے

ترے بن کس طرح یارب مری اوقات گزرے گی
اسی سے دل کو بیتابی ہے کیونکر رات گزرے گی

تمھیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کم خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

ضبط کر کے ہم قلق کو دل میں گھبرائے بہت
منع بیتابی کیا پر اس میں دُکھ پائے بہت

دل کو لے آئے تھے اس کوچے سے ہو کر ہم خفا
پر دل و جاں ہمپہ اب مل کر بلا لائے بہت

جیتے جی ہم تو نہ جاتے اسکے کوچے سے کبھی
کیا کریں اس نے بھی غصے ہمپہ فرمائے بہت

کون اب کہہ دے اسے عاشق پہ اپنے رحم کھا
جان حسرت نے تری دوری میں غم پائے بہت

رونا نہیں جو یار و اپنا دیار چھوٹا
مرنا ہے یہ کہ ہم سے اب کوئے یار چھوٹا

گر رنج راہ کھینچا، تو کچھ الم نہیں ہے
ہے یہ الم کہ ہم سے وہ رہگذار چھوٹا

انتخاب کلام رضا علی وحشت

کون جانے کہ یہ کافر نظری کس کی ہے
خیر اتنی ہے کہ ثابت مرا ایماں نہ رہا

جان دینے سے مجھے داد وفا تھی مطلوب
بیوفا چار گھڑی بھی تو پشیماں نہ رہا

ملگئی وحشتِ دیوانہ کو تھوڑی سی زمیں!
اب وہ ہنگامہ سرِ کوچۂ جاناں نہ رہا

کیا کیا مجھے تغافلِ ساقی کا تھا گلہ
دیکھا تو میں ہی درخورِ لطف و کرم نہ تھا

جفائے دشمناں اور بیوفائیہائے یاراں سے
بہت غمدیدہ ہو کر وحشت آزردہ جاں نکلا

سر جھکائے جو آتے ہو وحشت
مگر اُس بزم میں گزر نہ ہوا

اللہ اللہ یہ کافر نظری کا عالم
زیب دیتا ہے تجھے دشمنِ ایماں ہونا

نگاہ کتنی ہے بیکسانہ ٹپک رہی ہے بلا کی حسرت
صدا ہے گویا مری خموشی، شہید ہوں شوق گفتگو کا

خوب نہیں یہ اختلاط کھیل نہیں ہے دوستی
اے غمِ یار سوچ کر اے دلِ زار دیکھکر

حال چمن خزاں میں بھی ایسا کبھی ہوا نہ تھا
اپنا جو حال ہو گیا رنگِ بہار دیکھکر

نہ اُٹھ اے خروش سحر گہی غمِ نیم شب تو اثر نہ کر
ہے دل اُس کا نازک و بیخبر اُسے میرے دل کی خبر نہ کر

ہے یہی خلش مری زندگی کہیں مٹ نہ جائے یہ چارہ گر
مری زیست کا جو خیال ہے تو علاج زخمِ جگر نہ کر

کیا جانے کہاں سے دلِ مضطر میں لگی آگ
کس گھر سے اُٹھی آگ کہ اس گھر میں لگی آگ،

قسمت میں نا امیدی و حسرت ہے کیا کروں
اُس بیوفا سے مجھ کو محبت ہے کیا کروں

کس کو خبر نہیں ہے کہ دیتا ہے وہ فریب
یاں تو فریب کھانے کی عادت ہے کیا کروں

میں بیمروت اُس کو کہوں گا نہ زینہار
یہ اقتضائے رسمِ مروت ہے کیا کروں

کسی عنواں سے ہو پر ذکر تو ہے شاہد وے کا
مزہ آتا ہے اے واعظ مجھے تیری نصیحت میں

مجھ پر ہے وہی لطف جو اوروں پہ رہا ہے
ناقدر شناسی نہیں صاحب تو یہ کیا ہے

اتنا بھی نہیں یاد کہ ہے کس کی مجھے یاد
اے بیخودیِ شوق یہ کیا رنگ ہے تیرا

انداز میں شوخی میں شرارت میں حیا میں
واں ایک نہ اک بات نکلتی ہی رہے گی

تا بہ گفتار تمنا کا پہونچنا معلوم
ہم ترے جورِ تغافل کی روش جان گئے

جستجو تنگ آرزو نکلی
درد رسوا ہوا دوا کے لئے

مطبوعات موصولہ

ادب اور سماج پروفیسر سید احتشام حسین کے گیارہ تنقیدی مقالات کا تیسرا مجموعہ ہے جسے کتب پبلشرز لمیٹیڈ بمبئی نے شایع کیا ہے۔ فہرست یہ ہے:۔ اصول نقد۔ افسانوی ادب کی اہمیت۔ اُردو کا لسانیاتی مطالعہ ۔ اُردو ادب میں آزادی کا تخیل ۔ جدید اُردو ڈرامہ ۔ خوجی ۔ مسلمان اور ہندی۔ غالب کی بُت شکنی ۔ فرقہ پرستی اور ادیب ۔ ادیب حب الوطنی اور وفاداری ۔ حالی اور پیروی مغربی ۔

اس فہرست سے تو صرف اس قدر معلوم ہو سکتا ہے کہ جن مباحث پر قلم اُٹھایا گیا ہے، وہ کس قدر اہم اور دلچسپ ہیں، لیکن ان مباحث پر جس قابلیت سے گفتگو کی گئی ہے اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے احتشام حسین صاحب، اس وقت قدر اول کے نقادوں میں سے ہیں اور ان کے مقالے تحقیق و استدلال اور سنجیدگی کے لحاظ سے بڑے گرانقدر ہوتے ہیں۔ کاشکے ان کی تحریروں میں تھوڑا سا Humour بھی ہوتا جو تنقید کے لئے ضروری ہے۔ ضخامت ۱۹۰ صفحات۔ مجلد معہ گرد پوش، کتابت طباعت وغیرہ نفیس۔ قیمت ۶/۱۲ ۔

نراس میں آس صالحہ عابد حسین کے چار افسانوں اور تین ادبی مقالوں کا مجموعہ ہے جو غالباً اس سے قبل رسایل میں شایع ہو چکے ہوں گے۔ یہ تمام افسانے اور مقالے ملک کی موجودہ فضا کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں اور ان کے ذریعہ سے وہ درس اخوت و انسانیت دیا گیا ہے جو تمام مذاہب کی جان ہے۔

صالحہ نہ صرف مشہور بلکہ واقعی بہت خوب لکھنے والی خاتون ہیں اور نہ صرف زبان و انداز بیان، بلکہ ٹکنک اور تجزیۂ کردار کے لحاظ سے بھی ان کی ہر تحریر معیاری چیز ہوتی ہے۔ اس مجموعہ کے تین ادبی مقالے انشاء عالیہ کا نمونہ ہیں اور جن کو دیکھ کر مصر کی آلنہ حی سامنے آجاتی ہیں۔ ضخامت ۱۸۴ صفحات۔ طباعت و کتابت وغیرہ بہت صاف، مجلد معہ گرد پوش کے۔ قیمت ۶/۱۲ ۔ ملنے کا پتہ :۔ کتب پبلشرز لمیٹیڈ بمبئی ۔

گالی مہندر ناتھ کے سات افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مہندر ناتھ، عہد حاضر کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح یہ بھی انھیں حالات و واقعات کو سامنے رکھتے ہیں، جو معاشی و معاشرتی کشمکش کی زندگی میں روزبیش آتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا تعلق نہ رومانی دنیا سے ہوتا ہے نہ کسی فلسفیانہ ماحول سے بلکہ متوسط الحال اور نیچے طبقے کے اس زندگی سے جس میں انسان کبھی روٹی، کپڑے کے لئے ایڑیاں رگڑتا نظر آتا ہے یا پھر

شراب، عورت اور جوانی سے کھیلتا ہوا۔ اس لئے ان افسانوں کی خوبی یہی ہے کہ ان میں جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل مکمل ہے اور بغیر کسی جھجک کے وہ سب کچھ کہہ دیا گیا ہے جو شاید یوں سنجیدہ صحبتوں میں آزادی کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ حجم ۱۶۴ صفحات، کاغذ دبیز، طباعت و کتابت بہت صاف، مجلد معہ گرد پوش کے قیمت دو روپیہ بارہ آنہ ملنے کا پتہ :- کتب پبلشرز لمیٹیڈ بمبئی۔

کوکھ جلی راجندر سنگھ بیدی کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بیدی بھی ترقی پسند اسکول کے بہت مقبول افسانہ نگار ہیں اور نہ صرف ٹکنک بلکہ تجزیۂ جذبات، کردار نگاری، اور ادبی رجحانات کے لحاظ سے بھی درجۂ خاص کے مالک ہیں۔ ان کے افسانوں میں کھلنڈرا پن کم اور جوش و ولولہ زیادہ ہوتا ہے۔ زبان و بیان پر بھی انھیں بڑی قدرت حاصل ہے اور جاندار اچھوتا پن ان کے ہر ہر فقرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ حجم ۲۲۲ صفحات۔ طباعت و کاغذ وغیرہ نفیس مجلد معہ گرد پوش کے۔ قیمت سے ر۔ ملنے کا پتہ :- کتب پبلشرز لمیٹیڈ بمبئی۔

تاریخ ایران پاستان مولوی محمد خلیل الرحمان مرحوم کی تصنیف ہے جسے کتابستان کراچی نے شایع کیا ہے مرحوم تاریخی ذوق کے لحاظ سے ملک میں کافی شہرت رکھتے تھے اور تاریخ کی اچھی اچھی کتابوں کا ترجمہ کر کے انھوں نے اُردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ایران کی تاریخ سے بھی انھیں بہت دلچسپی تھی چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے زرتشت نامہ اور تاریخ ایران پاستان دو کتابیں شایع کیں جو ختم ہو چکی تھیں اس لئے ان میں سے دوسری کتاب مصنف کے صاحبزادے پروفیسر نعیم الرحمان ام۔اے کی نظر ثانی کے بعد کتابستان نے شایع کی ہے۔

اس کتاب میں عہد قبل تاریخ سے سامانی عہد تک کے بادشاہوں کے حالات درج کئے گئے ہیں اور جا بجا نقشے اور تصاویر دیکر اسے زیادہ دلچسپ بنایا گیا ہے۔ ضخامت ۱۵۲ صفحات۔ کاغذ و طباعت و کتابت بہت نفیس — قیمت ۴ ہے۔ ملنے کا پتہ :- کتابستان الہ آباد یا کراچی۔

ارمغانِ آلام ڈاکٹر سید محمود وزیر ترقی صوبۂ بہار، جسوقت احمد نگر کے قلعہ میں دوسرے اکابر کانگریس کے ساتھ مقید تھے تو اُردو فارسی کے جو اشعار انھیں پسند آتے تھے، بیاض میں درج کرتے جاتے تھے اور یہ اس مجموعۂ اشعار کا نام ہے جسے نظامی بک ایجنسی بدایوں نے شایع کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے انتخاب اشعار سے ان کے ہمہ گیر ذوق پر روشنی پڑتی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں مولانا عبدالمالک آروی نے بڑا فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے اس بیاض کو خاص اہتمام سے چھاپا گیا ہے۔

سلک گہر تذکرہ ہے صوبۂ متوسط اور برار کے صاحب دیوان شعراء کے جسے جناب جاوید انصاری برہانپوری نے مرتب کیا ہے۔ یہ تذکرہ ۸۲ شعراء کا ہے جس میں سب سے پہلا نام شاہ باجن کا نظر آتا ہے جو

۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور آخری نام سید عنایت علی آغا زبرہانپوری کا ہے جن کی ولادت ۱۹۰۲ء میں ہوئی تھی۔ اس مجموعہ میں صرف انھیں شاعروں کو نہیں لیا گیا جو صوبۂ متوسط و برار سے وطنی تعلق رکھتے تھے، بلکہ ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن کو ان صوبوں کی تاریخ سے کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہے۔ امید ہے کہ جاوید انصاری کی یہ کاوش و کوشش مقبول ہوگی۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ جناب جاوید انصاری۔ برہان پور۔ سی پی۔

بادبان مجموعہ ہے کمال احمد صدیقی کی چند آزاد نظموں کا۔ جن میں ردیف و قافیہ کی پابندی بالکل نہیں کی گئی ہے۔ پروفیسر سید احتشام حسین نے لکھا ہے کہ "اُن کی آزاد نظموں میں روانی اور دلکشی کے ساتھ ساتھ بلند خیالی بھی ہے۔ اور موسیقیت بھی جو بہت کم آزاد نظم نگاروں کے حصّہ میں آئی ہے"۔

لیکن افسوس ہے کہ ہم اپنی نااہلیت و بے بصری کی وجہ سے دونوں میں سے کوئی چیز ان میں نہیں پاتے۔ حجم ۸۰ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ حلقۂ ارباب ذوق۔ لال باغ لکھنؤ۔

ریاضِ دانش مختصر سا دیوان ہے، فہمی برہانپوری کا جسے جناب جاوید انصاری نے شایع کیا ہے، کلام صاف ہے۔ حجم ۴۲ صفحات۔ قیمت ۱۰ر۔ ملنے کا پتہ:۔ جناب جاوید انصاری۔ خیراتی بازار۔ برہانپور۔

کلام شفیق جونپوری:۔

تسلط دے تو فطرت بھی جہانداری کے قابل دے
خدایا کچھ نہ دے پھر بھی یہ سودینے کا دینا ہے

ترانہ ہی گلستاں کے لئے کافی نہیں یارب
اگر انسان کے پہلو میں تو انسان کا دل دے

یہ کہکر شمع ساری رات تنہائی پہ روئی ہے
عطا کر پنجۂ شاہیں جو منقارِ عنادل دے

وہ قوت دے کہ ٹکرلوں ہر اک گرداب دریا سے
کہ یارب روشنی دی ہے تو پروانوں کی محفل دے

بچھڑنا قافلے سے اور شمعِ راہ کا بجھنا
جب اُلجھانا ہے موجوں میں تو کشتی دے نہ ساحل دے

خدا بندے کو پہلے امتیازِ حق و باطل دے
خدا دشمن کو بھی یہ غم نہ دے یارانِ منزل دے

لے جا نہ گھر کی سمت ہوائے وطن ابھی
باقی ہے کچھ مزاج میں دیوانہ پن ابھی

ابرِ بہار لاکھ برستا رہے مگر
نم ہوگی آنسوؤں سے زمینِ چمن ابھی

بجھنے کو شمع خسرد و پرویز ہے مگر
ہے انقلاب منتظرِ کوہکن ابھی

ہر چند آفتاب نمودار ہو چکا
ٹھہرا رہی ہے صبح کی پہلی کرن ابھی

بجلی کے قمقمے بھی ہیں شمع و چراغ بھی
محرومِ روشنی ہے مگر انجمن ابھی

دُنیا پہونچ رہی ہے کہاں سے کہاں شفیق
تم ہو شریکِ محفلِ شعر و سخن ابھی

باب پنجم

طرزِ ادا

میر انیس نے مرثیوں کی زبان اور طرزِ ادا کے بابت جو اصول مقرر کئے تھے وہ انھوں نے ظاہر بھی کر دئے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں:۔

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ دردکی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے
زیب ہے خال سیہ چہرۂ گلرو کے لئے

داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی کوشش سب سے زیادہ یہ تھی کہ موقع محل کے لحاظ سے موزوں زبان پیدا کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ رنگیں بیانی کو بھی ضروری سمجھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے:۔

ہے لعل و گہر سے یہ دہن کان جواہر
ہنگامِ سخن کھلتی ہے دکان جواہر
ہیں بند مرصع تو ورق خوان جواہر
دیکھے اسے یاں ہے کوئی خواہانِ جواہر

اپنی شیریں کلامی اور اعجاز بیانی کے متعلق کہتے ہیں کہ:۔

ہر جا ہے ملکِ نظم میں نظم و نسق مرا
کہتے ہیں انتظام جسے ہے وہ حق مرا
ہے سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا
برسوں پڑھیں تو یاد نہ ہوئے سبق مرا

پائی نہیں کبھی یہ حلاوت نبات میں
مضمون نوٹپک رہے ہیں بات بات میں

ہر چند سہل ممتنع کلام کا ادق ہونا اور برسوں تک اس کا یاد نہ ہونا متضاد سی بات ہے تاہم میر انیس کے اس قسم کے بیانات سے جو ہمیں جا بجا مراثی میں ملتے ہیں ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ طرزِ ادا کے سلسلہ میں جتنے بھی اہم اصول آجکل

کے محققین علم بیان ضروری سمجھتے ہیں ان سب سے میر انیس واقف تھے۔ مگر یہ کہنا کہ وہ ان اصول سے کبھی ہٹے نہیں غلطی ہوگی۔ کیونکہ تمام شاعروں کی طرح ان کو بھی ارتقا کے مدارج طے کرنا پڑے، ان کے وہی مراثی ان اصول پر پورے اترتے ہیں جو انھوں نے اخیر عمر میں کہے۔ اور ترقی کی درمیانی منزل سے گزرتے ہوئے وہ کبھی کبھی بہک بھی گئے تھے چنانچہ انھوں نے کبھی کبھی مرزا دبیر کے رنگ میں بھی مرثیہ لکھنے کی کوشش کی اور بجائے سادہ اور سلیس بندوں کے بے اثر بند موزوں کر گئے ہیں۔

بعض مقامات پر وہ محض لفاظی پر اتر آتے ہیں اور پورے پورے بند محض قافیہ پیمائی ہو کر رہ گئے ہیں۔ بیان و بدیع کا استعمال بھی انھوں نے کبھی کبھی بے موقعہ کیا ہے۔ مگر اس قسم کی لغزشیں ان کے کلام میں وہی نوعیت رکھتی ہیں جیسے سورج میں داغ۔ جس طرح سورج کی تابش کی وجہ سے اس کے داغ نہیں دکھائی دیتے ویسے ہی میر انیس کے کلام کا جادو ان کے کلام کی خامیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

مولانا شبلی کے موازنہ کا بہترین جملہ وہی ہے جہاں انھوں نے میر انیس کے کلام کی فصاحت اور بلاغت کو واضح کیا ہے اور میر انیس کی خداداد قوت رنگیں بیانی کو سراہا ہے۔ بعد کے نقادوں نے انھیں کو کچھ ادل بدل کر رقم کر دیا ہے جو مولانا کی کتاب میں ملتی ہیں۔

نیچرل طرز ادا:۔ میر انیس کے طرز کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ نیچرل ہے۔ انگریزی کا یہ لفظ ہماری زبان میں حالی نے داخل کیا۔ چنانچہ ہمارے یہاں اگر کسی رنگ کو نیچرل کہا جائے تو ذہن میں وہی حالی والا رنگ سامنے آتا ہے۔ صحیح نیچرل رنگ پیدا کرنے کے لئے شاعر کی فطرت کو ہر قسم کی بناوٹ سے پاک ہونا اور ساتھ ہی ساتھ اسکے اندر اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتیں موجود ہونا بھی ضروری ہیں۔ طرز ادا کے سلسلہ میں عموماً دو قسم کے فنکار نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو خاص قسم کی خصوصیات کو برتنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور مخصوص الفاظ یا مخصوص صنعت کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ رنگ اکتسابی کہلاتا ہے۔ بعض ادیب، اس رنگ کو اس طرح برتتے ہیں کہ ان کے لئے قدرتی ہو جاتا ہے۔ مگر ایسے لوگ اس شاعری کے لئے زیادہ موزوں ہیں جن کا مقصد تمامتر عکس کشی ہو۔ چنانچہ شیکسپیر بھی جن نظموں میں مصوری سے کام لیتا ہے وہی رنگ اختیار کرتا ہے، میر انیس کا رنگ بھی وہی ہے جو نیچرل طور پر مصور شاعر کا ہونا چاہئے۔ ماہرین نفسیات مصور شاعروں کے طرز ادا کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مصور شاعر میں احساسی تجربات کی قوت پہلی چیز ہے۔ مگر یہ تجربے یا تاثرات مبہم ہوتے ہیں اور شاعر کو زبان و بیان کے ذریعہ سے ان کو واضح کرنا ہوتا ہے اور مخصوص الفاظ، انداز بیان اور لب و لہجہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس میں تشبیہ و استعارہ وغیرہ بھی شامل ہیں، ایک سچا شاعر جس کے ذہن کا صحیح رجحان مصوری کی طرف ہے، اس کے ذہن میں یہ تمام صنایع بالکل نیچرل حالت میں آئیں گے اور اس طرح اس کے بیانات ان لوگوں کے بیانات سے مختلف ہوں گے جو محض رسمی طور پر بیان و بدیع سے کام لیتے ہیں۔ میر انیس کا کلام

پڑھنے سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے تمام بیانات نیچرل ہیں اور ان بیانات کے سلسلہ میں جتنے بھی رنگ استعمال کئے گئے ہیں وہ سب نیچرل ہیں۔

ان کی طبیعت کا رجحان ان کو گہرائی میں نہ لے جاتا بلکہ مختلف رنگوں میں پیش کرتا تھا، اسی لئے ان کے یہاں غالب کی طرح کم الفاظ میں زیادہ مطالب نہ ہوتے تھے جو ایپک شاعروں کے لئے بہت ضروری ہے، بلکہ کچھ ڈھیلا پن ہوتا تھا۔ مثلاً ان چھ مصرعوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے:۔

حضرت سے جب برادرِ خوش خو جدا ہوا — تنہا ہوئے کہ زینتِ پہلو جدا ہوا
جو گھر کی روشنی تھا وہ مہرِ ضیا جدا ہوا — جس سے قوی تھے ہاتھ وہ بازو جدا ہوا

تیغِ خزاں چلی شہِ مرداں کے باغ میں
ٹوٹی کمر حسینؑ کی بھائی کے داغ میں

میر انیس کا یہ رنگ خطابتی ہے اور ڈراما یا ایپک سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، تاہم اس کے نیچرل ہونے میں کوئی شک نہیں۔

سہل ممتنع رنگ — ان کے رنگ کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ سہل ہے اور اکثر سہل ممتنع ہے۔ بعض لوگ ان کے رنگ کو سادہ کہتے ہیں۔ مگر یہ غلطی ہے کیونکہ سادہ کلام عموماً وہ ہوتا ہے جو ایک طرف تو مشکل پسندی سے پاک ہو اور دوسری طرف رنگینی سے۔ میر انیس کا کلام مشکل پسندی سے تو ہر طرح دور ہے مگر رنگینی اس کا خاص عنصر ہے اور انکے کلام پہ خصوصیت یہاں بہت نمایاں ہو جاتی ہے جب وہ بات چیت کے مناظر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً :۔

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر — اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر — مسلم کا خط آئے تو کریں کوچ کی تدبیر

لِلّٰہ ابھی قبرِ پیمبر کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

وہ گھر ہے ملک رہتے تھے جس گھر کے نگہباں — کیوں اپنے بزرگوں کا مکاں کرتے ہیں ویراں
کوفے کی بھی خلقت تو نہیں صاحبِ ایماں — بی بی یہ مدینے کی تباہی کا ہے ساماں

ایک ایک شقی دشمنِ اولادِ علی ہے
شمشیرِ ستم واں سرِ حیدر پہ چلی ہے

اُجڑے گا مدینہ جو یہ گھر ہوئے گا خالی — برباد ہی یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی
کیا جانے پھر آئیں کہ نہ آئیں شہِ عالی — حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی

زہرا ہیں نہ حیدر نہ پیمبر نہ حسن ہیں
اب ان کی جگہ آپ ہی یا شاہِ زمن ہیں

گرمی کے یہ دن اور پہاڑوں کا سفر آہ — ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ — ان کو تو نہ لے جائیں سفر میں شہ ذیجاہ

قطرہ بھی دمِ تشنہ دھانی نہیں ملتا
کوسوں تلک اس راہ میں پانی نہیں ملتا

منہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا — آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا — لکھا تھا اسی سن میں مسافر انھیں ہونا

کیا ہوگا جو میداں میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کمھلائیں گے ماں ہاتھ ملے گی

یہ تمام بیانات نہایت سہل روز مرہ کی زبان میں ہیں اور صنائع حد درجہ نیچرل طور پر لائے گئے ہیں مثلاً آخری ٹیپ میں پھول سے تشبیہ اس قدر آسانی اور بے ساختگی سے لائی گئی ہے کہ اس صنعت کی طرف ہمارا دھیان جاتا ہی نہیں۔

مادی لطافت ـــــ انیس کی دوسری خصوصیت رنگیں بیانی ہے۔ ان کا کوئی بند یا مصرع ایسا نہ ہوگا جو کسی نہ کسی لطیف رنگ سے خالی نہو۔ ان کی زبان اور بیان میں ایک خاص قسم کا شاعرانہ حسن ہے اور یہ حسن اسی وجہ سے ہے کہ وہ مادی اشیاء سے پیدا ہونے والے تاثرات ہمارے سامنے لاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کہیں انھوں نے اخلاقی یا فلسفیانہ بات کہی ہے تو اسے بھی مادیت ہی بنا دیا ہے۔ مثلاً سفر میں مسافر کی تکلیف کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے — منزل پہ پہونچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹے کو نکالے — ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے

درماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر بھی جو بیٹھے تو اٹھاتا نہیں کوئی

آپ نے دیکھا کہ چھالا، کانٹا اور تھک کر بیٹھ جانا سب مادی مناظر سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں۔ لیکن وہ انھیں اپنی قدرت بیان سے تاثراتی رنگ بخش دیتے ہیں۔

زندگی اور مصوری :۔ تیسری حقیقت میر انیس کے کلام کی شگفتگی اور اس کا زندگی میں ڈوبا ہوا ہونا ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی جادو کے اثر سے جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً صبح کے سلسلہ میں :-

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح

بہت سادہ تشبیہ ہے کہ مگر مصرعے کو پڑھتے ہی صبح کی سرخی کا رنگ اپنے پورے اثر کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی طرح :-

تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

شیرینی :- چوتھی صفت ان کے کلام کی شیرینی ہے۔ ان کے مرثیے خاموشی کے ساتھ پڑھنے کے لئے نہیں لکھے گئے چنانچہ جس وقت ہم ان کے مصرعوں کو بلند آواز کے ساتھ پڑھتے ہیں تو ان میں عجیب مٹھاس محسوس ہوتی ہے یہ ان کی فصاحت کا کمال ہے۔ جس پر وہ فخر کرتے ہیں :-

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری — ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری
رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری — شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

نفاست و پاکیزگی :- پانچویں صفت ان کے کلام کی نفاست ہے۔ ان کے زمانہ میں اودھ کی تہذیب پورے عروج پر تھی اور معیشت و معاشرت میں حد درجہ تہذیب برتی جاتی تھی۔ اس لئے میر انیس کا رنگ شاعری بھی تہذیب اور نفاست کا نمونہ ہے۔ اور وہ اپنے کلام کو نفیس بنانے میں بہت وقت صرف کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے اشعار میں باوجود بے ساختگی کے خاص رکھ رکھاؤ بھی نظر آتا ہے۔ انگریزی شعرا میں یہ صفت میر انیس کے ہمعصر ٹنی سن Tennyson کے کلام اور طرز کی بھی اہم صفت ہے اور اس معنے میں یہ دونوں شاعر ایک سے ہیں۔

سنجیدگی و متانت :- چھٹی صفت میر انیس کی یہ ہے کہ اس میں ہم کو سکوت و اطمینان کا اثر غالب معلوم ہوتا ہے۔ لکھنؤ کی فضا ہمیشہ سے سکوت کی طرف راغب ہے۔ غدر سے پہلے اور کچھ دن بعد تک بھی یہاں کے لوگ بہت اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی بات چیت، لب و لہجہ اور رہنے سہنے کے طریقوں سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زندگی اطمینان سے کٹتی ہے۔ میر انیس کی طرز ادا پر بھی یہی سکوت اور اطمینان ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ اس میں غالب کی سی گرمی نہیں، میر کے کلام کا جانکاہ درد نہیں۔ اقبال کی ہیجانی نہیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی ساکت تالاب کے پاس کھڑے ہیں اور اس کے صاف و شفاف پانی میں چاروں طرف کی چیزوں کے عکس

دکھائی دے رہے ہیں۔ جہاں میر انیس نے بیقراری اور بے تابی کی تصویریں کھینچی ہیں وہاں بھی سکوت ہی غالب ہے مثلاً ان کے حضرات کا رونا کمر ہی توڑ دیتا ہے اور کہیں کسی زور دار عمل میں تبدیل نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں لوگوں کی بات چیت اس اطمینان کے ساتھ ہوتی ہے جیسے وہ لوگ ہنگامی کیفیت کا احساس ہی نہیں رکھتے، یوں تو ہر جگہ یہ مہذب سکوت میر انیس کے یہاں پایا جاتا ہے، مگر ایسے مقامات میں جو ذیل سے ظاہر ہوتے ہیں بہت زیادہ کھل جاتا ہے :۔

میں ہوں سردار شباب چمنِ خلدِ بریں — میں ہوں انگشترِ پیغمبرِ خاتم کا نگیں
میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں — مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں
ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفلِ عالمِ امکاں میں اندھیرا ہو جائے

یا ایسے موقعوں پر جہاں کوئی سکوت کا عالم بھی شاعر کو دکھانا منظور ہوتا ہے جیسے :۔

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر — ظاہر تھے جا بجا حشراتِ زمیں کے گھر
تھے وقفِ آشیانِ ابابیل سقف و در — نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

خوشگوار مبالغہ :۔ ساتویں صفت یہ ہے کہ میر انیس صنائع میں زیادہ مبالغہ سے کام نہیں لیتے اور اس باب میں میر انیس، میر تقی اور میر حسن سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں اور اسی لئے اکثر ان کے سراپا میں بھی مبالغہ کا رنگ حقیقی نظر آتا ہے :۔

وہ ریشِ پاک اور وہ چہرہ کی آب و تاب، — نکلا ہے چیر کر شبِ یلدا کو آفتاب
کچھ جا بجا جو کھل گیا ہے ریش کا خضاب — رخصت ہے مل رہے ہیں گلے پیری و شباب
تا وقتِ عصر اور زمانِ حیات ہے،
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے

نسائیت :۔ آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ میر انیس کے طرز میں نسائیت زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے لہجہ میں وہ نرمی و نزاکت ہے جو لکھنؤ کی عورتوں کی بات چیت میں ملتی ہے۔ لکھنؤ کی زبان خاص طور پر بیگماتی ہے اور مردوں کی زبان پر بھی اس کا اثر پڑا ہے کیونکہ مرد بھی زیادہ تر وقت گھر ہی میں کاٹتے تھے۔ ان مقامات پر جہاں انھوں نے اہلِ حرم کی بات چیت رقم کی ہے وہاں تو یہ لہجہ نہایت صاف ہی ہے مگر امام حسین علیہ السلام کی بات چیت

کے لہجے میں بھی وہی لوچ وہی نرمی اور وہی نزاکت ہے۔
مثال کے طور پر حضرت علی اکبر کی زبان کا لہجہ ملاحظہ ہو:۔

اکبر نے کہا باپ سے یہ ماں کو سنا کر — خادم کو نہ روکیں گی پھوپھی اور نہ مادر
وہ آپ کہیں گی کہ فدا ہو مرا دل بر — حضرت سے زیادہ انھیں پیارا نہیں اکبر
زہراؑ کی بہو یہ ہیں تو وہ بنتِ علیؑ ہیں
جو چاہیں سو دیں یہ بھی سخی وہ بھی سخی ہیں

فرزندوں کو حضرت پہ پھوپھی جان نے وارا — بیٹی ہوئی رانڈ ان کی مگر دم نہیں مارا
اس وقت میں مجھ کو بھی نہیں کرتے کی یارا — ہاں آپ کی فرقت نہیں ہونے کی گوارا
دھڑکا ہے رنڈاپے کا جو رنجیدہ ہیں اماں
ناداں نہیں سنجیدہ و فہمیدہ ہیں اماں

میر انیس نے جہاں انعکاسی اثرات پیش کئے ہیں وہاں ان کے لہجے کی نسائیت اور زیادہ نمایاں ہے۔
مثلاً جوان پسر کے مرنے پر کچھ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:۔

یعقوب کے آگے جو پسر پر چھی کو کھاتا — ہے دل کو یقیں منہ سے کلیجہ نکل آتا
فرزند کا دکھ باپ سے دیکھا نہیں جاتا — اکبر سے پسر کو کوئی ہاتھوں سے گنواتا
ہوتا ہے قلق گل ہوا گر خار کے نیچے
رکھے تو کلیجہ کوئی تلوار کے نیچے

غیروں کے لئے اپنی کمائی کوئی کھوئے — دل باپ کا مانے کہ پسر قبر میں سوئے
خوں میں کوئی اپنے درِ یکتا کو ڈبوئے — فرزند جواں قتل ہوا اور باپ نہ روئے
فرزند کا غم بانوئے ناشاد سے پوچھو
یہ درد کسی صاحبِ اولاد سے پوچھو

زور و روانی:۔ نویں خصوصیت انکے کلام کا زور ہے۔ مثلاً:۔

یارب چمنِ نظم کو گلزار ارم کر — اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر — گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کی پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

بعض مقامات پر اس زور کی نوعیت بدل جاتی ہے اور اس میں وہی کیفیت پائی جاتی ہے جو ہم کو با اخلاق اور بامروت حضرات کی گفتگو میں ملتی ہے، یعنی ایک قسم کی زندہ روانی، ایک دھارے کا نہ ٹوٹنے والا بہاؤ ان کے کلام میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً :-

نیزے تانے ہوئے اڈے چلے آتے ہیں سوار — ہیں کماندار پرا باندھے ہوئے تیس ہزار
صفیں کھینچے ہوئے چوگرد کھڑے ہیں جو سوار — غل ہے مہلت نہ ملے سبطِ نبی کو زنہار
برقِ شمشیر ہر اک جا پہ چمک جاتی ہے
جس طرف دیکھتے ہیں موت نظر آتی ہے

نہ ہے غمخوار نہ ہمدرد نہ یاور کوئی، — نہ بھتیجا ہے نہ بیٹا نہ برادر کوئی
نہیں اتنا ہے خبر پوچھے جو آکر کوئی — ایک اللہ تو ہے اور نہیں سر پہ کوئی
تھے جو غمخوار وہ ریتی پہ پڑے سوتے ہیں
اپنی تنہائی پہ شاہ دو جہاں روتے ہیں

مکتوبات نیاز

تین حصوں میں اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل نئی چیز ہیں، سب کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔ قیمت حصہ اول و دوم فی حصہ تین روپیہ حصہ سوم چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱- چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲- مادیئن کا مذہب۔

نہایت مفید دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت:-

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فنا اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و ننگ نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے

قیمت:-

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے

قیمت حصۂ اول للعہ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶ نگار بک ایجنسی، لکھنؤ

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیاتِ مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ -

قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -

قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری، فروری، مارچ سنہ ۴۶ء

یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فنِ انتقاد پر ملک کے بہترین اہلِ قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں۔

قیمت ہر حصہ کی ایک روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد دریا نمبر" ہے جس میں ایک ہمثیل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا -

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھولیں جنپر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں - اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیے - قیمت دو روپیہ - علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ ۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے - "منیجر"

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہو سکتا - سالانہ بیرونِ ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے